اسلام پر پروفیسر رام دیو کے اعتراضات کا جواب

از

سیّدنا حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد

خلیفۃ المسیح الثانی

اسلام پر ایک آریہ پروفیسر کے حملہ کا جواب

از حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد خلیفۃ المسیح الثانی

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ

خدا کے فضل اور رحم کے ساتھ

ھُوَ النَّاصِرُ

آریہ پروفیسر صاحب کی تقریر

پچھلے دنوں لاہور میں آریہ سماج کے دونوں حصوں کے جلسے تھے۔ ان جلسوں میں جہاں اپنے قومی اُمور کے متعلق تقریریں ہوئیں وہاں دوسرے مذاہب سے اپنے مذہب کا مقابلہ کر کے بھی دکھایا گیا۔ ان تقاریر میں سے گورد کل پارٹی کے ایک لیکچرار پروفیسر رام دیو صاحب کی تقریر خصوصیت کے ساتھ عام پبلک کے خیالات میں ایک جوش پیدا کر رہی ہے۔ اس تقریر کا موضوع یہ تھا کہ دیگر مذاہب مثلاً بُدھ مذہب اور مسیحی مذہب اور اسلام اس زمانہ کے حالات کے مطابق نہیں ہیں اور سائنس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ لیکن ہندو مذہب چونکہ خود سائنس کا سرچشمہ ہے اس کو علوم کی ترقی سے خطرہ نہیں۔ پس یہی آئندہ دنیا کا مذہب ہے۔

تقریر سے مسلمانوں میں جوش

ان مسلمانوں میں جن کو اس لیکچر کا علم ہؤا ہے ایک عام جوش ہے کہ اس صلح کے زمانہ میں اس قسم کے مضامین پر لیکچر دینے سے اس اتحاد میں رخنہ ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے جو بڑی قربانیوں کے بعد حاصل ہوا تھا۔ مگر میرے نزدیک آریہ سماج کی یہ رُوح اس بے غیرتی کے مقابلہ میں جو بعض مسلمانوں نے دکھائی ہے بہت زیادہ قابل تحسین ہے۔ آریہ سماج نے ثابت کر دیا ہے کہ جو تھوڑا بہت تعلق بھی اسے مذہب سے ہے وہ اس کو اس سیاسی شورش کے زمانہ میں بھی چھوڑ نہیں سکتی بایں کہ وہ مذہبی جوش کو سیاسی کامیابی کے لئے ضروری سمجھتی ہے لیکن بعض مسلمانوں نے اس کے برخلاف اپنے مذہبی احکام کو دنیاوی

فوائد کے لئے قربان کر دیا ہے۔

مختلف الخیال اقوام کا کن امور میں اتحاد ہو سکتا ہے

میرے نزدیک وہ لوگ جو پروفیسر صاحب کے اس لیکچر پر اس رنگ میں معترض ہیں انہوں نے انسانی دماغ کی بناوٹ پر غور ہی نہیں کیا اور دوسروں کو تو انھوں نے کیا سمجھانا تھا خود اپنے نفس کو بھی انھوں نے نہیں سمجھا۔ وہ خیال کرتے ہیں کہ جس طرح ہم نے اپنے ہندو بھائیوں کو ساتھ ملانے کے لئے گائے کی قربانی چھوڑ دی ہے وہ بھی ہمیں اپنے ساتھ ملانے کے لئے اپنے مذہبی خیالات کے اظہار سے باز رہیں اور اسلام کے ساتھ اس کا مقابلہ نہ کریں حالانکہ وہ اتحاد جس میں یہ شرط رکھی جائے کہ اختلاف آراء کا اظہار نہ ہو دو مختلف الخیال اقوام میں ناممکن ہے۔ ایسا اتحاد لمبے عرصہ تک قائم نہیں رہ سکتا اور ضرور ہے کہ جلد یا بدیر ضمیر اپنی طاقت کو ظاہر کرے اور ایک فریق سے ایسے خیالات کا اظہار کرائے جو دوسرے فریق کے نزدیک درست نہیں ہیں۔ جو لوگ اتحاد کے لئے یہ شرط رکھتے ہیں کہ کسی قسم کا اختلاف نہ ہو وہ انسانی فطرت سے واقف نہیں ہیں اور ہرگز اس قابل نہیں کہ اتحاد قائم کرنے کا کام ان کے ہاتھوں میں دیا جائے۔ اتحاد کے قیام کا ایک ہی ذریعہ ہوتا ہے کہ اختلاف کے وجود کو تسلیم کر لیا جائے اور صرف ان امور میں اختلاف کو روکا جائے جن پر کہ اتحاد کرنا مدنظر ہے اور اس طرز کے اختلاف کو روکا جائے کہ جس اختلاف سے اس کام کا چلنا مشکل ہو جائے جس میں اتحاد کیا گیا ہے۔

مثلاً ایک ہندو اور ایک مسلمان مشترک دکان کرنے لگے ہیں تو اگر وہ یہ شرط کریں کہ مسلمان نماز نہ پڑھا کرے اور ہندو مندر میں نہ جایا کرے تو یہ اتحاد بناوٹی ہے اور خلاف قدرت ہے یہ ضرور ٹوٹ کر رہے گا اور اتنی عمر نہیں پائے گا جتنی کہ صحیح بنیادوں پر رکھا ہوا اتحاد پایا کرتا ہے۔ یہ اتحاد یا تو اخلاق فاضلہ کا خون کریگا اور بے غیرتی پیدا کریگا یا جلد ٹوٹ کر فتنہ و فساد کا دروازہ کھول دیگا اور امر اول کا نتیجہ بھی آخر میں فساد ہی ہوگا کیونکہ جو شخص ان عقائد کو جن پر وہ یقین رکھتا ہے یا ان اعمال کو جن کو وہ مستحسن خیال کرتا ہے دنیاوی فوائد کے حصول کے لئے چھوڑتا ہے وہ کسی خاص فائدہ کی امید میں اس اتحاد کو بھی ترک کر سکتا ہے۔ پس اتحاد وہی اتحاد ہے جس کی بنیاد اس امر پر ہو کہ حق اور راستی کے خلاف جو امور نہ ہوں گے ان میں ملکر کام کیا جائیگا اور ایک دوسرے کے عقیدہ اور خیال میں یا اس کے ذاتی عمل میں دست اندازی نہ کی جائیگی۔

گائے کی قربانی ترک کرنے کا سمجھوتہ

بعض مسلمانوں نے اس نکتہ کو نہیں سمجھا اور جوش میں آکر بلا کسی خاص سمجھوتے کے جو اس فعل کو جائز قرار دیتا گائے کی قربانی کو ترک کرنے کی تحریک شروع کر دی اور اب ہندوؤں سے اس امر کی امید رکھتے ہیں جس کا انہوں نے وعدہ نہیں کیا تھا۔ مسلمان یہ اُمید ہرگز نہیں کر سکتے کہ اگر یہ کوئی غلطی کریں تو ان کے خوش کرنے کے لئے دوسری قوم بھی جو ان سے اتحاد رکھنا چاہتی ہو باوجود عقل اور سمجھ کے اسی قسم کی ایک غلطی کرے اس سے زیادہ ناجائز مطالبہ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ اگر کوئی مطالبہ تھا تو اسے ابتداء ہی میں پیش کرنا چاہئے تھا۔ اب تو "مُشتے کہ بعد از جنگ یاد آید بر کلۂ خود باید زد" والی مثال ہے۔

دنیا سے مذہب کی حکومت نہیں اُٹھ سکتی

ان مسلمانوں کو خوب یاد رکھنا چاہئے کہ جب تک دنیا آباد ہے اور جب تک انسان اس میں بستا ہے اس وقت تک مذہب کی حکومت دُنیا سے اُٹھ نہیں سکتی۔ مختلف زمانوں میں مذاہب کا اثر مٹانے کی کوشش کی گئی ہے لیکن انکی گرفت اگر کسی وقت عارضی طور پر ڈھیلی ہو بھی گئی ہے تو پھر تھوڑے ہی عرصہ کے بعد اس کا پنجہ مضبوط ہو گیا ہے پس گو انہوں نے مذہب کے متعلق کسی قسم کی گفتگو کو خلاف اتحاد قرار دیا ہو مگر فطرت انسانی اس فیصلہ کو قبول نہیں کر سکتی یہ فیصلہ بدل کر رہے گا اور اس وقت تک اتحاد قائم نہ ہو گا جب تک اس کی بنیاد صحیح بنیادوں پر نہ ڈالی جائے گی۔ یعنی چند مقررہ قواعد پر جو پہلے سے منضبط کر لئے جائیں تاکہ بعد میں فتنہ کی گنجائش نہ رہے۔

پروفیسر صاحب کے دلائل اسلام کے خلاف

اس تمہید کے بعد میں پروفیسر رام دیو صاحب کے لیکچر کے اس حصہ پر روشنی ڈالنا چاہتا ہوں جو اسلام کے متعلق ہے۔ اخبار بندے ماترم لاہور کے تیس نومبر کے پرچہ میں جو خلاصہ پروفیسر صاحب کے لیکچر کا لکھا گیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اسلام کو اس زمانہ کی ضروریات کے پورا کرنے کے ناقابل ان دلائل سے قرار دیا ہے کہ (۱) مسلمانوں کا رنگ گورا نہیں اس لئے وہ یورپ کی مشکلات کو حل نہیں کر سکتے (۲) بعض مسلمان بھی اسلام کی تعلیم پر اعتراض کرنے لگ گئے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سائنس کے حملوں کا اسلام مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اس دعویٰ کی تائید میں انھوں نے مندرجۂ ذیل مثالیں بیان کی ہیں۔ مسٹر خدا بخش ایم اے نے لکھا ہے کہ قرآن کریم محمد صاحب

(صلی اللہ علیہ وسلم) کی ڈائری تھی جس میں وہ اپنے خیالات لکھ لیا کرتے تھے۔ سید امیر علی صاحب اپنی کتاب سپرٹ آف اسلام میں لکھتے ہیں کہ قرآن کریم میں جو فرشتوں کا ذکر ہے وہ محمد صاحب (صلی اللہ علیہ وسلم) کا وہم اور شاعرانہ نازک خیالی تھی۔ پھر وہ لکھتے ہیں کہ محمد صاحب (صلی اللہ علیہ وسلم) نے غلطی کی کہ چند دنوں کے لئے مشرکوں کے کہنے پر بُتوں کو مان لیا۔ اسی طرح سید امیر علی پردہ سسٹم کے خلاف ہیں اور کثرت ازدواج کے مسئلہ کو زنا کاری خیال کرتے ہیں۔ صوفی فرقہ کے لوگ ہندوؤں کی طرح لفظ رام رام کی بجائے اللہ اللہ کر کے ذکر کرتے ہیں۔ مظہر الحق صاحب بیرسٹر نے گوشت کو انسانوں کے لئے قدرتی خوراک نہیں بتایا۔ ایک اور لیڈر مسٹر یوسف علی ایم اے نے دہلی میں مسلمانوں کو کہا کہ اگر پاکیزگی چاہتے ہو تو رامائن پڑھو۔ پس اسلام بھی زمانہ ماضی کا مذہب ہے اور نئے تعلیم یافتہ لوگوں کو تسلی نہیں دے سکتا۔

پروفیسر صاحب کے دلائل کی حقیقت

یہ دو دلائل ہیں جو پروفیسر صاحب نے اسلام کے خلاف دیئے ہیں اور وہ خوش ہیں کہ ان دلائل کے ذریعہ انہوں نے اسلام کو مذہبی میدان جنگ میں سے بیکار کر کے واپس کر دیا ہے مگر میرے نزدیک ان سے زیادہ بودے اور ان سے زیادہ کمزور اور کوئی دلائل نہیں ہو سکتے اور اگر بندے ماترم کے ایڈیٹر صاحب نے کسی مخفی بغض کی وجہ سے جو ان کو پروفیسر صاحب سے ہو ان کی طرف وہ بات منسوب نہیں کر دی جو انہوں نے نہیں کہی اور ان دلائل کو نظر انداز نہیں کر دیا جو پروفیسر صاحب نے اپنے دعویٰ کی تائید میں اس وقت دیئے ہوں تو یقیناً ہر ایک عقلمند کے لئے یہ بات نہایت تعجب خیز اور حیرت انگیز ہے کہ ایک پروفیسر نے اس قسم کے دلائل ایک تعلیم یافتہ جماعت کے سامنے بیان کئے۔

رنگت کے متعلق اعتراض

پہلی دلیل جو پروفیسر صاحب نے دی ہے وہ مسلمانوں کی رنگت کے متعلق ہے۔ پروفیسر صاحب کے نزدیک مسلمان تعلیم یافتہ یورپ کا علاج نہیں کر سکتے کیونکہ وہ سفید رنگ کے نہیں۔ یہ دلیل یونہی نہایت بیہودہ ہے لیکن اس شخص کے منہ پر جو خود کالی کہلانے والی قوم میں سے ہے اور اپنے مذہب کے بالآخر غالب آ جانے کی خبر دینے کے لئے کھڑا ہوا ہے اور بھی زیادہ قابل مضحکہ معلوم ہوتی ہے۔ اگر مسلمان بوجہ سفید رنگ نہ رکھنے کے یورپ کی مشکلات کو حل نہیں کر سکتے تو آریہ صاحبان ان سے بھی زیادہ سیاہ رنگ رکھتے ہوئے یورپ کی مشکلات کو کیونکر حل کر سکتے ہیں۔ پروفیسر صاحب کو یہ بھی خیال نہ آیا

کہ مسلمانوں کا کچھ حصہ یورپ کا آباد کار رہے جبکہ آریہ مذہب کے پیرو صرف کالی نسلوں تک محدود ہیں۔

کسی سچائی کے پھیلنے میں اس کے ماننے والوں سے نفرت کی وجہ سے ناکامی نہیں ہو سکتی

مجھے تعجب آتا ہے کہ پروفیسر صاحب نے ایسی بات زبان پر آنے ہی کیوں دی۔ اگر ان کے دل میں اس قسم کا مضحکہ خیز خیال پیدا ہوا بھی تھا تو ان کو چاہئے تھا کہ اس کو دباتے نہ کہ بر سر اجلاس اس کا اظہار کرتے۔ کیا کوئی شخص جو خدا پر ایمان رکھتا ہے یہ یقین کر سکتا ہے کہ کوئی سچا مذہب اس لئے کسی قوم میں پھیلنے میں ناکام رہے گا کہ اس کے ماننے والوں سے لوگ نفرت کرتے ہیں؟ وہ کون سا مذہب ہے جس سے دوسرے مذاہب نے نفرت نہیں کی؟ جس وقت اسلام عرب کے لوگوں کے سامنے پیش کیا گیا ہے اس وقت ان لوگوں کو کیا مسلمانوں سے اس سے کم نفرت تھی جو اس وقت یورپ کے لوگوں کو مسلمانوں سے ہے۔ عرب اس سے بدتر سلوک مسلمانوں سے کرتے تھے جو اس زمانہ میں اہلِ یورپ مسلمانوں سے کرتے ہیں اسی طرح جب اسلام ہندوستان میں آیا ہے تو کیا مسلمان یہاں کے اصل باشندوں کے محبوب تھے؟ وہ ان سے سخت نفرت کرتے تھے مگر اسلام کی خوبیوں نے ان کے دلوں پر فتح پا ہی لی اور کروڑوں آدمی اسلام کے حلقہ بگوش ہو گئے اسی طرح یورپ بھی جب اسلام کی خوبیوں پر آگاہ ہو گا تو اس کی نفرت خود بخود جاتی رہے گی۔ ہر ایک کام اپنے وقت پر ہوتا ہے سینکڑوں سال کی عداوت اور بغض ایک دن میں نہیں جاتا وہ خیالات جو بطور ورثہ کے کسی قوم کو ملتے ہیں ان کا بکلی دُور کرنا کافی وقت چاہتا ہے اور قومیں کبھی یکدم کسی نئی بات کو قبول نہیں کر لیا کرتیں۔ مذہب کا فائدہ تو رُوحانی فائدہ ہے اور بوجہ لطیف ہونے کے تیز نظر آدمی کو ہی نظر آ سکتا ہے۔ وہ عام فائدہ کی باتیں جن میں انسان کے جسمانی فوائد مرکوز ہوتے ہیں ان کی اشاعت بھی مشکل سے ہوتی ہے۔ چیچک کے ٹیکے نے ہمارے ملک کو کس قدر فائدہ ہؤا ہے ہزاروں آدمی ہر سال اندھے ہو جاتے تھے جو اس ٹیکہ کے سبب سے اس صدمہ سے محفوظ ہو گئے ہیں لیکن باوجود اس کے اس قدر مفید ہونے کے لوگ شروع شروع میں اس کی سخت مخالفت کرتے تھے اور بچوں کو چھپا دیتے تھے۔ بیس تیس سال کے تجربہ اور تربیت کے بعد جا کر لوگ اس کے فائدہ کے قائل ہوئے ہیں۔ ریل اور تار کیسی مفید ایجادات ہیں لیکن عرب لوگ اب تک ریل کے فوائد کے قائل نہیں ہو سکے بار بار ترکوں نے ریل بنائی اور انہوں نے توڑ دی۔ جاپان کس قدر ترقی یافتہ ملک ہے لیکن اس کے ستسومہ قبیلہ نے جس کا جاپان کی موجودہ

ترقی میں بہت سا حصہ ہے اور جس کی اَنتھک کوششوں کے نتیجہ میں جاپان کو غیر ملکی حکومتوں کے دخل سے آزادی حاصل ہوئی ہے تار کے اجراء پر حکومت کی سخت مخالفت کی تھی اور بزور شمشیر اس کے اس فعل کا مقابلہ کیا تھا اور اسی طرح ریل کو اپنے علاقہ میں بننے نہ دیا تھا اور یہ مخالفت اس قدر لمبے عرصہ تک رہی کہ ۱۹۰۶ء سے پہلے وہاں ریل نہ بنائی جا سکی حالانکہ یہ قبیلہ شاہی فرمانبرداری میں سب قبائل پر فوقیت رکھتا تھا اور ایڈمرل ٹوگو[1] اور مارشل ٹا کا ماری جیسے لائق آدمی اس میں پیدا ہوئے۔ پس جب لوگ دنیاوی فوائد کو پُرانی عادات کی بناء پر رد کر دیتے ہیں تو رُوحانی خیالات کو جو ان کے دیرینہ خیالات کے خلاف ہوں کیوں نفرت کی نگاہ سے نہ دیکھیں اور کیوں ان کو رد نہ کریں۔ ایسے خیالات کی اشاعت کے لئے وقت چاہئے۔ خواہ اسلام کو یورپ مسلمانوں کے ایشیائی ہونے کے سبب سے نفرت کی نگاہ سے دیکھے خواہ اس سبب سے کہ یہ مذہب ان کے مذہب کے بعد پیدا ہؤا ہے مگر اسلام اگر سچّا ہے تو وہ قدیم سنت کے مطابق ان کے خیالات پر غالب آکر رہے گا اور یورپ کی نفرت کو محبت سے بدل کر رہے گا۔

یورپ پر اسلام کے غالب آنے کے آثار

چنانچہ ہم اس کے آثار ابھی سے دیکھتے ہیں۔ باوجودیکہ یورپ کے لوگوں میں اسلام کی تبلیغ شروع کئے ابھی زیادہ عرصہ نہیں گذرا کہ حق جُو لوگوں میں تحقیق کا خیال پیدا ہو گیا ہے اور آہستہ آہستہ ایک ایک دو دو کر کے وہ اس کے قبول کرنے کی طرف متوجہ ہو رہے ہیں۔

اسلام کے مقابلہ میں ویدک دھرم نے کیا کیا

پروفیسر صاحب کو یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ جس مذہب کی نسبت ان کا خیال ہے کہ وہ قومی اختلاف کے سبب یورپ کے لوگوں میں اشاعت نہیں پا سکتا وہ تو دنیا میں اپنی تبلیغی کامیابیوں کے شاندار نمونہ خواہ وہ وحشی قوموں میں ہی کیوں نہ ہوں دکھا بھی چکا ہے لیکن جس مذہب کی حمایت میں وہ کھڑے ہوئے ہیں اُس نے تو وحشی قوموں میں بھی کوئی کامیابی حاصل نہیں کی۔

کیا اسلام دُنیا کا آئندہ مذہب نہیں ہو سکتا

دوسری دلیل پروفیسر صاحب نے اسلام کے خلاف یہ دی ہے کہ وہ سائنس کے حملہ کی برداشت نہیں کر سکا اور خود مسلمانوں کے ایمان متزلزل ہو گئے ہیں اس لئے وہ دنیا کا آئندہ مذہب نہیں ہو سکتا۔

یہ سوال کہ دنیا کا آئندہ مذہب ہونے کے لئے کن شرائط کا پایا جانا کسی مذہب کے لئے

ضروری ہے ایک وسیع سوال ہے لیکن میرے نزدیک پروفیسر رام دیو صاحب کے لیکچر پر غور کرتے وقت اس کو چھیڑنے کی ضرورت نہیں۔ اس وقت اسی قدر کافی ہے کہ اس سوال کے جس پہلو کو پروفیسر رام دیو صاحب نے پیش کیا ہے اس پر روشنی ڈالی جائے۔

پروفیسر صاحب بیان کرتے ہیں کہ اسلام اس لئے دُنیا کا آئندہ مذہب نہیں ہوسکتا کہ اس کے پیرؤوں میں سے تعلیم یافتہ طبقہ اس کی تعلیم میں اپنے لئے تسلی نہیں پاتا۔ یا دوسرے لفظوں میں یوں کہو کہ کسی مذہب کے چند افراد کا اس کی تعلیم پر تسلی نہ پانا اس امر کا ثبوت ہے کہ وہ مذہب اب لوگوں کو تسلی نہیں دے سکتا۔

میرے نزدیک پروفیسر رام دیو صاحب کا ایک تعلیم یافتہ جماعت کے سامنے اس قسم کا معیار پیش کرنا اس جماعت کی سخت ہتک ہے کیونکہ اس کے یہ معنی ہونگے کہ ان کے سامنے جس قدر لوگ بیٹھے تھے وہ عقل اور خرد سے ایسے خالی تھے کہ ان کے سامنے جو کچھ بھی بیان کر دیا جاتا وہ اسے تسلیم کرنے کے لئے تیار تھے۔ میرے نزدیک ہر ایک تعلیم یافتہ انسان بلکہ ہر ایک انسان اس امر سے واقف ہے کہ ہر ایک مذہب اور عقیدہ کے لوگوں میں ایسے لوگ پائے جاتے ہیں کہ جو گو بظاہر ان کے ساتھ شامل ہوں مگر باطن میں یا تو ان سے بالکل علیحدہ ہوتے ہیں یا اس کے بعض خیالات سے ان کو اختلاف ہوتا ہے۔ پس ایک تعلیم یافتہ جماعت کے سامنے یہ دلیل پیش کرنی کہ چونکہ اس کے کروڑوں افراد میں سے ایک دو ایسے آدمی بھی ہیں جو اس کی بعض تعلیموں سے اختلاف رکھتے ہیں اس لئے اس مذہب سے اب دنیا کو ہدایت نہیں ہوسکتی۔ گویا انکی آنکھوں میں خاک جھونکنا ہے یا ان کی عقل اور ان کی حق طلبی پر حرف گیری کرنا ہے۔

مسلمان کہلا کر اسلام کے خلاف کہنے والوں کی حقیقت

پروفیسر رام دیو صاحب نے جن چند مسلمانوں کے اقوال کو اپنی تائید میں پیش کیا ہے وہ دو حالوں سے خالی نہیں ہیں یا تو ان لوگوں نے اسلام کے خلاف جو باتیں کہی ہیں اس سے ان کی مراد یہ ہے کہ اسلام سچا مذہب نہیں ہے اور خدا تعالیٰ کی طرف سے نازل نہیں ہؤا اور یا ان کا یہ مطلب ہے کہ دوسرے لوگ جو ان مسائل کے متعلق اپنے خیالات ظاہر کرتے ہیں وہ اسلام کے مطابق نہیں بلکہ اسلام درحقیقت اس خیال کو پیش کرتا ہے جو انھوں نے بیان کیا ہے۔ اگر پہلی صورت ہے یعنی وہ لوگ اسلام سے متنفر ہو گئے ہیں اور اس کے خدا تعالیٰ کی طرف سے ہونے کے قائل نہیں رہے اور قرآن کریم کو انسان کی تصنیف خیال کرتے ہیں اور رسول کریم

صلی اللہ علیہ وسلم کو صرف ایک فلسفی یا تجربہ کار مصلح سمجھتے ہیں تو پھر وہ لوگ مُرتد ہیں اور کونسا مذہب ہے جس میں سے کبھی کوئی مُرتد نہیں ہؤا اور اگر دوسری صورت ہے یعنی وہ لوگ اسلام پر اعتراض نہیں کرتے بلکہ ان کا یہ یقین ہے کہ اسلام کی جو تشریح دوسرے لوگ کرتے ہیں وہ غلط ہے اس کی تشریح وہ ہے جو انہوں نے پیش کی ہے۔ تو پروفیسر صاحب بتائیں کہ وہ کونسا مذہب ہے جس کی تشریح کے متعلق اس کے ماننے والوں میں اختلاف نہیں اور کیا وہ اس اصل کے ماتحت جو انھوں نے قائم کیا ہے دنیا کے تمام مذاہب کو جن میں آریہ سماج اور ویدک دھرم بھی یقیناً شامل ہوگا جھوٹا سمجھ لیں گے۔

تعصب کی پٹی

تعصب انسان کی آنکھ پر پٹی باندھ دیتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ پروفیسر صاحب کو اتفاقاً ان چند اختلافات پر اطلاع ہوگئی اور انھوں نے سمجھ لیا کہ اب اسلام مٹا اور اس کا نشان دنیا سے غائب ہؤا۔ کیونکہ بعض مسلمانوں نے بھی قرآن کریم یا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتراض کر دیا ہے اور اس خوشی میں اس امر کو بھول گئے ہیں کہ یہ دلیل نہیں بلکہ صرف ایک تمنا ہے جو نہ آج تک بَر آئی ہے نہ آئندہ اس کے بر آنے کی کوئی صورت ہے۔

کیا پروفیسر صاحب کی دلیل سے آریہ مت سچا ثابت ہوسکتا ہے

اب مَیں پروفیسر صاحب کو اس امر کی طرف توجہ دلاتا ہوں کہ اگر یہ دلیل جو انھوں نے پیش کی ہے اسی نتیجہ پر پہنچاتی ہے جو انہوں نے نکالا ہے تو خود آریہ مت بھی اس کی زد سے نہیں بچ سکتا۔ چنانچہ مثال کے طور پر مَیں آریہ سماج کے چند ممبروں کے اقوال پیش کرتا ہوں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ آریہ سماج ایسے لوگوں سے پُر ہے جو آریہ سماج کی تعلیم پر یقین نہیں رکھتے اور اسے دنیا کے لئے کافی نہیں خیال کرتے۔

پہلی مثال

چنانچہ سب سے پہلے تو مَیں خود لالہ لاجپت رائے صاحب کو ہی لیتا ہوں۔ جن کے اخبار بندے ماترم میں پروفیسر رام دیو صاحب کے لیکچر کا خلاصہ چھپا ہے۔ یہ صاحب آریہ سماج کے ایک سرگرم ممبر تھے بلکہ انھوں نے قریباً اپنی زندگی ہی اس کی ترقی کے لئے وقف کی ہوئی تھی لیکن اب وہ آریہ سماج کے متعلق جو خیال رکھتے ہیں وہ یہ ہیں:۔

مَیں ویدوں کو ایشور گیان نہیں مانتا۔ اپنے ضمیر کے مطابق ان کا پرچار نہیں کر سکتا۔ ویدک مشنری نہیں بن سکتا۔ حتّٰی کہ مَیں آریہ سماجی بھی نہیں کہلا سکتا۔

بقول آریہ اخبار ہمالہ ۱۳؍ مئی ۱۹۲۰ء انھوں نے اپنے ایک مضمون میں یہ بھی لکھا تھا کہ اب وید ہدایت کا کام نہیں دے سکتے ان کا خیال چھوڑ دو۔

ان پُرانی باتوں کو اگر جانے بھی دیا جائے تو بھی ان کی وہی تقریریں جو انہوں نے اسی سال کے سماج کے جلسہ میں کی ہیں اس امر پر روشنی ڈالنے کے لئے کافی ہیں کہ وہ اب سماج کے اُصول کے قائل نہیں۔ بندے ماترم اخبار کے اسی نمبر میں جس میں پروفیسر رام دیو صاحب کا لیکچر چھپا ہے لالہ لاجپت رائے صاحب کے دو لیکچروں کا بھی ذکر ہے۔ ایک وہ لیکچر جو انھوں نے کالج پارٹی کے جلسہ میں دیا ہے اور ایک وہ مختصر لیکچر جو انھوں نے وچھووالی کے جلسہ میں دیا ہے۔ وچھو والی کے جلسہ میں جو کچھ انھوں نے بیان کیا اس کا ایک فقرہ یہ ہے کہ "میں آریہ سماج کے اندر کام کروں یا نہ کروں لیکن آریہ سماج کے احسان کو کبھی نہ بھولوں گا۔" یہ احسان کوئی مذہبی احسان نہیں بلکہ اس احسان سے مُراد وہ سیاسی خیالات ہیں جو آریہ سماج مذہب کے پردہ کے نیچے پھیلاتی ہے کیونکہ وہ کہتے ہیں شمالی ہندوستان کی بیداری کا باعث آریہ سماج کا کام ہے اگرچہ یہ بیداری کافی نہیں اور اس سے سوراجیہ حاصل نہیں ہو سکتا تاہم آریہ سماج نے زمین تیار کر دی ہے۔" آپ کو پالٹیکس میں جو کچھ روشنی نظر آتی ہے یہ سب کچھ آریہ سماج کے پرچار کا نتیجہ ہے۔" ان کے ان فقرات سے معلوم ہوتا ہے کہ آریہ سماج کے احسان سے ان کی مراد سیاسی احسان ہے ورنہ اس کے مذہبی اصول سے دستبردار ہو چکے ہیں اور ویدوں کو خیرباد کہہ چکے ہیں۔

کالج پارٹی میں ان کا جو لیکچر ہُوا ہے اس میں بھی انہوں نے یہ بیان کیا کہ "لوز ڈکنس ہندوستانیوں پر اعتراض کرتا ہے کہ وہ قدرت کی طاقتوں سے بھاگتے ہیں اور خوفزدہ ہو کر ان کی عبادت کرنے لگتے ہیں اور انہیں قابو میں لانے کی کوشش نہیں کرتے۔ یہ اعتراض خواہ کبھی گذشتہ زمانہ میں صحیح نہ ہو لیکن میری رائے میں پندرہ سو سال سے یہی ہماری تباہی کا باعث ہُوا ہے۔" ان کے ان فقرات سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہندو مذہب کی موجودہ حالت کو تو یقیناً قابلِ تسلی نہیں سمجھتے اور پچھلے زمانہ کے متعلق ان کو شبہ ہے کہ آیا وہ بھی زمانۂ حال کی طرح کا تھا یا اس سے اچھا تھا۔ اسی طرح وہ بیان کرتے ہیں کہ "بعض اصحاب کا یہ خیال غلط ہے کہ ہمارے پراچین رشی مُنی لاثانی اور بینظیر تھے۔ یورپ اور امریکہ میں اب بھی ایسے رشی ہیں جو اپنی پاکیزگی، بے غرضی اور رُوحانیت کے لحاظ سے ان قدیم رشیوں سے کسی طرح کم نہیں کوئی کہہ سکتا ہے کہ ہکسلے[۱] ڈاروِن[۲]، ہربرٹ سپنسر[۳]، مارکونی[۴] کی زندگی پاک نہیں۔ یا یہ پراچین رشیوں سے کسی طرح کم تھے۔"

کیا لالہ لاجپت رائے صاحب کے ان خیالات کی بناء پر کہا جا سکتا ہے کہ آریہ سماج اب ماضی کا مذہب ہو گیا ہے اور آئندہ اس سے کسی اصلاح کی اُمید رکھنا فضول ہے کیونکہ اس کے بڑے بڑے

لوگوں پر یورپ کی علمی ترقی کا اثر ایسا گہرا پڑا ہے کہ اب وہ ان عقائد کو ترک کر بیٹھے ہیں جو ان کے مذہب نے بتائے ہیں۔ اگر کسی شخص کا خواہ وہ لیڈر ہی کیوں نہ ہو آریہ سماج سے کلی طور پر قطع تعلق کرنا یا اس کے بعض اصول کو ترک کر دینا اس امر کا ثبوت نہیں کہ آریہ سماج اب ایک مُردہ مذہب ہو گیا ہے تو مسلمان کہلانے والے کروڑوں آدمیوں میں سے اگر چند لوگ اسلام کے اُصول کے خلاف اپنی رائے کا اظہار کریں تو اس سے اسلام کے زمانہ ماضی کا مذہب ہو جانے کا ثبوت کہاں سے نکل آیا۔

دوسری مثال

دوسری مثال رائے بہادر لالہ مولراج صاحب ایم اے کی ہے جو آریہ سماج کے ایک دیرینہ رکن ہیں۔ ان کی نسبت پرکاش ۱۳ رجون ۱۹۲۰ء میں ایک صاحب نے شائع کرایا ہے کہ انھوں نے بیان کیا کہ وہ وید کو نہ پہلے مانتے تھے اور نہ اب مانتے ہیں۔ بلکہ انہوں نے یہ بھی کہا کہ مَیں نے رشی دیانند صاحب سے بھی کہا تھا کہ وہ اس شرط کو کہ آریہ سماج میں داخل ہونے کے لئے وید کا ماننا ضروری ہے نکال دیں تاکہ وید کو نہ ماننے والے بھی آریہ سماج میں شامل ہو سکیں۔ اب پروفیسر رام دیو صاحب بتائیں کہ اگر مسٹر خدا بخش کے قرآن کریم کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ڈائری قرار دینے سے اسلام کے متعلق شبہ پڑ جاتا ہے کہ وہ ضرورت زمانہ کو پورا نہیں کر سکتا تو لالہ مولراج صاحب ایم اے کے وید نہ ماننے سے کیوں یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وید بھی اب ضرورت زمانہ کو پورا نہیں کر سکتے۔

تیسری مثال

تیسری مثال لالہ منشی رام صاحب کی ہے جو گوروکل کانگڑی کے بانی کہلانے چاہئیں اور جن کے ماتحت کام کرنے کا فخر غالباً پروفیسر رام دیو صاحب کو بھی ہے۔ لالہ منشی رام صاحب نے نیوگ کے عقیدہ کی نسبت جسے پنڈت دیانند صاحب ہندو مذہب کی تعلیمات میں شامل کرتے ہیں بیان کیا کہ یہ نیچ اور گرے ہوئے لوگوں کا فعل ہے (دیکھو آریہ پتر کا لاہور) گو لالہ صاحب نے سُنا ہے کہ بعد میں اپنے کلام کی تشریح کی مگر وہ تشریح آریہ صاحبان کے عام طریق عمل کو مدنظر رکھتے ہوئے ان کے بیان کو زیادہ نہیں سُلجھاتی۔ کیونکہ آریہ صاحبان میں ایسے لوگ شاذ ہی پائے جاتے ہیں جو نیوگ کی تعلیم پر علی الاعلان عمل کرنے کے لئے تیار ہوں اور لالہ منشی رام صاحب تو عقلمند اور فہمیدہ آدمی ہیں ان سے کم عقل کے آریہ صاحبان کو بھی میں دیکھتا ہوں کہ وہ اس عقیدہ سے بیزار نظر آتے ہیں تو جب ان کی اس بیزاری کے باوجود پروفیسر صاحب کو آریہ مذہب دنیا کی ہدایت کے لئے کافی نظر آتا ہے تو پھر سوال یہ ہے کہ جب آریہ صاحبان نیوگ کو بے حیائی کہیں اور اس سے

آریہ مت کی صداقت پر کوئی شبہ وارد نہ ہو تو کیا وجہ ہے کہ کوئی مسلمان اگر کثرت ازدواج کو زنا قرار دیدے تو اس سے یہ نتیجہ نکالا جائے کہ اسلام اس وقت دُنیا کو تسلی نہیں دے سکتا حالانکہ یہ دونوں باتیں ایک ہی قسم کی ہیں۔ بلکہ ان میں ایک ایسا فرق ہے جو اسلام کے حق میں مفید ہے اور وہ یہ کہ نیوگ کی تعلیم واقع میں بُری ہے اور کثرت ازدواج کی تعلیم حکمت سے پُر ہے۔ چنانچہ لالہ لاجپت رائے صاحب نے ۴؍ دسمبر ۱۹۲۰ء کے بندے ماترم میں پروفیسر رام دیو صاحب کے مضمون کے متعلق معذرت کرتے ہوئے کثرت ازدواج کی نسبت لکھا ہے کہ:۔

"میری ذاتی رائے میں اسلام کا قانون شادی نہ صرف زناکاری نہیں ہے بلکہ بہت حد تک زناکاری کو روکتا ہے۔"

پھر خود ہندوؤں کے بڑے بڑے لوگ ایک سے زیادہ شادیاں کرتے رہے ہیں اور اب بھی کرتے ہیں لیکن ان کی اولاد کو کوئی ولدالزنا نہیں کہتا۔ گو مَیں یقین رکھتا ہوں کہ نیوگ سے پیدا ہونے والے لڑکے کو کوئی آریہ صاحب بھی اسی نظر سے نہ دیکھیں گے جس نظر سے بیاہتا بیوی کے بچوں کو دیکھا جاتا ہے۔ پس اگر کسی مذہب کی ایک بُری بات کو بُرا کہنے سے اس مذہب کی صداقت پر پروفیسر صاحب کے نزدیک کوئی حرف نہیں آتا تو کسی مذہب کی اچھی بات کو بُرا کہنے سے اس مذہب پر کیا اعتراض آئے گا۔

اگر بعض مسلمانوں نے کثرت ازدواج کو بُرا قرار دیا ہے تو آج یورپ کے سینکڑوں نہیں ہزاروں آدمی اسی مسئلہ کو دنیا کی مشکلات کا حل سمجھنے لگ گئے ہیں اور خود آریہ صاحبان کے بعض موجودہ اور پُرانے ممبر بھی اس کی تصدیق کرتے ہیں۔ چنانچہ وکیل اخبار نے ایک آریہ پنڈت صاحب کی نسبت لکھا ہے کہ انھوں نے بیان کیا کہ مادی زندگی میں سخت پرہیز گاری کی اُمید کرنا عبث ہے۔ پھر اس کا حل سوائے کثرت ازدواج کے اور کیا ہو سکتا ہے۔ لالہ لاجپت رائے صاحب نے بھی اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ دھرم شاستر بعض حالتوں میں خاوند کو اجازت دیتا ہے کہ ایک یا زیادہ بیویوں کی زندگی میں بھی اور شادی کرلے۔

چوتھی مثال چوتھی مثال آریہ گزٹ کے ایڈیٹر صاحب کی ہے جس نے بیوہ کے نکاح کے متعلق جسے پنڈت دیانند صاحب نے ناجائز قرار دیا ہے لکھا ہے کہ ایسے حالات و واقعات کی موجودگی میں بھی اگر ودھوا وواہ (نکاح بیوگان) کی مخالفت کرتے ہیں تو نہ معلوم اور کتنی تباہی کے نظارے وہ چاہتے ہیں جو ان کی آنکھیں کھول سکیں۔

آریہ صاحبان کے عقائد متزلزل ہو رہے ہیں

یہ مثالیں تو خاص آدمیوں کی ہیں لیکن خود آریہ سماج کے لیڈروں اور ان کے اخباروں کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ آریہ سماج کے ممبروں کے عقائد عام طور پر متزلزل ہو رہے ہیں اور عوام کے ہی نہیں بلکہ بڑے بڑے لوگوں کے۔ چنانچہ آریہ اخبار کانپور گزٹ لکھتا ہے:۔

"آریہ سماج میں ایک شخص اگر جنم سے ورن بیوستھا مانتا ہے تو دوسرا نیوگ سے صاف منکر ہے۔ تیسرا اگر ویدوں میں جادو ٹونا ظاہر کرتا ہے تو چوتھا سوامی دیانند جی کے وید بھاشیہ کے خلاف آواز اُٹھاتا ہے۔ اس پر طرہ یہ ہے کہ وہ اصحاب آریہ سماج کے عہدہ داروں میں شامل کئے جاتے ہیں۔"

شاید کانپور گزٹ کی رائے پروفیسر صاحب کے نزدیک اس قدر با وقعت نہ ہو اس لئے ان کے سامنے ہم گوروکل کانگڑی کے سابق گورنر لالہ منشی رام صاحب جن کے ماتحت پروفیسر صاحب بھی کام کرتے رہے ہیں کی رائے بھی پیش کر دیتے ہیں۔ لالہ منشی رام صاحب لکھتے ہیں:۔

"ہم بڑے بڑے تعلیم پر فخر کرنیوالوں سے واقف ہیں جو یہ کہتے ہوئے نہیں شرماتے کہ ویدوں پر بیوقوف بشواش کرتے ہیں۔ ایشور ودوانوں (عالموں) کے لئے کوئی چیز نہیں ہے ایشور کا ماننا سروسادھارن (عوام الناس) کے لئے اچھا ہے لیکن ہم آریہ سماج کو کام کرنیوالی سوسائٹی سمجھ کر سبھاسند (ممبر) ہوئے ہیں.......... ہمارے تعلیم یافتہ ممبر کہا کرتے ہیں کہ سپنسر اور بریڈلا کی زبان جاننے والے خدا نہیں مان سکتے۔"

اب پروفیسر صاحب بتائیں کہ جس جماعت کے تعلیم یافتہ اس کے لیڈر اپنے قول کے موجب عمل میں نہیں بلکہ عقیدہ میں اور کسی معمولی عقیدہ میں نہیں بلکہ خدا تعالیٰ پر ایمان لانے کے عقیدہ میں اس کی تعلیم کے مخالف ہوں اس کا کوئی فرد کسی دوسرے مذہب کے بعض افراد کی ایسی باتوں سے جو انہوں نے اپنے مذہب کے خلاف کہی ہوں یہ استدلال کرنے کا کب مجاز ہو سکتا ہے کہ اب وہ مذہب دُنیا کے لئے تسلی دینے کا موجب نہیں ہو سکتا اب ہمارا مذہب تسلی دیگا۔

ہندو مذہب میں اختلاف کثیر

یہ تو آریہ سماج کا حال ہے اب میں ہندو مذہب پر مجموعی نظر ڈالتا ہوں۔ ہندو مذہب میں اس قدر اختلاف ہے کہ اب تک ہندو کی کوئی تعریف ہی نہیں ہو سکی۔ بڑے بڑے ہندوؤں نے ہندو کی تعریف کرنی چاہی مگر نہیں کر سکے اور آخر تھک کر اقرار کیا کہ ہندو مذہب کوئی مذہب نہیں بلکہ سینکڑوں مذاہب

جو مسلمانوں کے حملہ سے پہلے ہندوستان میں موجود تھے۔ انہوں نے غیر اقوام کے حملہ کے مقابل جو اتحاد کیا تھا اسی کا نام ہندو مذہب ہے۔ حملہ آور قوموں کے لوگ ہر ایک ایسے شخص کو جو ہندوستان کا رہنے والا تھا اپنے مقابل پر لڑتے ہوئے دیکھ کر ان کے مذہبی اختلاف سے ناواقف ہونے کے سبب ہندو کہہ دیتے تھے اور اس سے ہندو مذہب ایک نئی اصطلاح بن گئی۔ بلکہ ہندو قانون بھی درحقیقت انگریزی زمانہ کی ایجاد ہے انگریزوں نے بعض تعلیم یافتہ ہندو مذاہب کی عام رسوم کو دیکھ کر ایک قانون تیار کر دیا اور خیال کر لیا کہ سب ہندو اس کے پابند ہیں اور اس کو رائج کر دیا اس سے ہندو قانون تیار ہو گیا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ بعض مسلمانوں کے لئے بھی اس وقت غلطی سے ہندو قانون وضع کر دیا گیا تھا۔ پس نہ ہندو مذہب کوئی مذہب ہے بلکہ سینکڑوں مذاہب کا سیاسی مجموعہ ہندو مذہب سے پکارا جاتا ہے اور نہ ہندو قانون کوئی قانون ہے بلکہ یہ قانون انگریزوں کا بنایا ہوا ہے۔ جنھوں نے اس ملک کے حالات سے ناواقف ہونے کے سبب بعض اقوام کے قانون کو سارے ہند کے غیر مسلم مذاہب پر جاری کر دیا۔ چنانچہ اب تک کئی اقوام ہندوستان میں ایسی موجود ہیں جنھوں نے اس قانون کو تسلیم نہیں کیا اور اس قانون سے بچنے کے لئے وہ اپنے مقدمات کو انگریزی عدالتوں میں لے جاتے ہی نہیں۔ مسٹر پی ٹی سری نواس اٹنگر ایم۔ اے۔ ایف۔ ایم لکھتے ہیں کہ ہندوؤں کے زمانہ میں کوئی ایسا ہندو قانون نہ تھا جو سب ہندوستان پر حاوی ہو کیونکہ اس ملک کی نہ دنیاوی حکومت ایک تھی نہ کسی ایک مذہبی انتظام سے وہ لوگ تعلق رکھتے تھے۔ پھر لکھتے ہیں کہ لاکھوں لاکھ آدمی ایسے ہیں جو عدالتوں میں اپنے مقدمات لے ہی نہیں جاتے بلکہ اپنے قومی قانون کے مطابق گھروں میں فیصلہ کر لیتے ہیں۔

ہندوؤں میں ویدوں کو نہ ماننے والی قومیں

ہندوؤں میں ایسی قومیں بھی پائی جاتی ہیں جو ویدوں کو نہیں مانتیں چنانچہ جینی ویدوں کو نہیں مانتے اسی طرح اور کئی قومیں ہندو کہلاتی ہیں لیکن وہ ویدوں کو نہیں مانتیں۔ تو کیا ایک دو اشخاص کے مسلمان کہلا کر قرآن کریم کا انکار کرنے سے اگر یہ نتیجہ نکل آتا ہے کہ قرآن کریم اب دنیا کو تسلی نہیں دے سکتا تو لاکھوں نہیں کروڑوں آدمیوں کا ہندو کہلا کر ویدوں کا انکار کرنا کیا یہ ثابت نہیں کرتا کہ وید بھی اب دُنیا کو تسلی نہیں دے سکتے۔ شاید پروفیسر صاحب کہیں کہ جین مت تو ایک علیحدہ مذہب ہے مگر اول تو میں امید نہیں کر سکتا کہ وہ ایسا کہہ سکیں کیونکہ اس وقت کی سیاسی جدوجہد کی موجودگی میں جبکہ ہندو ان اقوام کو بھی اپنے اندر شامل کرنے کی کوشش میں ہیں جو خود اپنے آپ کو ہندوؤں سے

علیحدہ رکھنا چاہتے ہیں جیسے کہ سکھ وہ ہرگز اس بات کا اعلان نہیں کریں گے کہ جین ہندو نہیں ہیں بلکہ ہندوؤں سے ان کا علیحدہ مذہب ہے لیکن اگر وہ یہ بھی کہدیں کہ یہ لوگ تو علیحدہ مذہب رکھتے ہیں تو یہی بات قرآن کریم کے ماننے والوں کی طرف سے بھی کہی جاسکتی ہے کہ جس وقت کسی شخص نے قرآن کریم کا انکار کیا اسی وقت وہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے اور مسلمان نہیں رہتا۔

ویدوں کے متعلق ہندوؤں کا پُرانا فیصلہ

پروفیسر صاحب کو تو اس زمانہ میں چند آدمی ایسے ملے ہیں جنھوں نے اسلام کی تعلیمات کے خلاف قلم اُٹھائی ہے مگر مَیں ان کی توجہ اس طرف پھیرتا ہوں کہ اگر یہ اصل جو انھوں نے پیش کیا ہے درست ہے تو پھر ہزاروں سال سے ویدک تعلیم دنیا کے لئے ناکافی ثابت ہو چکی ہے کیونکہ یہ کروڑوں بُدھ جو ہندوستان میں بستے تھے اور کروڑوں جینی جو اب تک ہندوستان میں موجود ہیں آج سے دو ہزار سال پہلے کے زمانہ سے ویدک تعلیم کو خیرباد کہہ چکے ہیں۔ یہ لوگ پہلے ہندو ہی تھے اور ویدوں کے ماننے والے تھے کیونکہ بدھ اور جینی کہیں باہر سے نہیں آئے یہ دونوں مذہب ہندوستان میں ہی پیدا ہوئے اور اسی ملک کے لوگوں نے ان کو قبول کیا۔ پس آج سے دو ہزار سال پہلے کروڑوں کی تعداد میں ویدک تعلیم کو ماننے والے اپنے عمل سے اس امر کی طرف اشارہ کر چکے ہیں کہ ویدک تعلیم دنیا کی روز افزوں علمی ترقی کا ساتھ نہیں دے سکتی اور علوم جدیدہ کے حاصل کرنے والوں کے لئے تسلّی کا موجب نہیں ہو سکتی۔

تازہ فیصلہ

یہ فیصلہ تو پُرانا ہے۔ کئی کروڑ آدمیوں کا تازہ فیصلہ بھی اس کی تصدیق میں موجود ہے۔ ہندوستان میں جو مسلمان اس وقت موجود ہیں ان میں سے اکثر اسی ملک کے باشندہ ہیں ان کا ویدوں کی تعلیم کو ترک کر کے اسلام کو قبول کر لینا کیا پروفیسر صاحب کے نزدیک اسی امر کا ثبوت ہوگا کہ ویدک تعلیم دنیا کی روز افزوں علمی ترقی کا ساتھ نہیں دے سکتی اور اب لوگوں کی تسلّی کے لئے کافی نہیں۔ اگر یہ بات نہیں تو وہ دوسروں کے لئے اس پیمانہ سے کیوں وزن کرتے ہیں جس پیمانہ سے وہ اپنے لئے وزن کرنے کے لئے تیار نہیں۔

مگر مَیں انہی مثالوں پر بس نہیں کرتا۔ مَیں پروفیسر صاحب کو ان کے نہایت واجب التعظیم لیڈروں کے اور ایسے ہی خیالات کی طرف توجہ دلاتا ہوں وہ ان پر غور کریں اور اس دلیل کی طاقت کو دیکھیں جو انھوں نے اسلام کے اثر کے خلاف دی ہے۔

ہندو مذہب کے متعلق ٹیگور کی رائے

مسٹر ستیندرا ناتھ ٹیگور آئی ۔ سی ۔ ایس لکھتے ہیں کہ تم کوئی عقیدہ رکھو خواہ دہریت کو اختیار کرو تم ہندو مذہب سے خارج نہیں ہو سکتے جس کے یہ معنے ہوئے کہ ہندو مذہب کوئی حقیقت اپنے اندر مخفی نہیں رکھتا بلکہ ایک نام ہے جو اس نام کو اختیار کرلے وہ خواہ کوئی عقیدہ رکھے وہ ہندو ہی ہے ۔ اس تعریف کی موجودگی میں جو ایسے لائق آدمی نے ہندو مذہب کی کی ہے کیا پروفیسر صاحب کہہ سکتے ہیں کہ ہندو مذہب دُنیا کو تسلی دے سکتا ہے ۔ مسٹر ٹیگور کے بیان کے مطابق تو کوئی خیال بھی دنیا میں پیدا ہو ہندو مذہب اس کو غلط دیکھ کر اس کی اصلاح کرنے کی بجائے اس کے اختیار کرنے کی اجازت دیدیتا ہے ۔ اس صورت میں ہندو مذہب نے دنیا کی اصلاح کی یا دنیا کے بڑھتے ہوئے علوم نے ہندو مذہب کی اصلاح کی ؟

ایک اور ہندو کی رائے

رائے بہادر لالہ بیج ناتھ اخبار لیڈر میں لکھتے ہیں کہ ویدوں کو ماننا یا برہمنوں اور گائے کی عزت کرنا موجودہ ہندو مذہب کے اُصول نہیں کہلا سکتے کیونکہ یہ باتیں آج کل ہمارے خیالات پر قابض نہیں ہیں ۔ پروفیسر صاحب بتائیں کہ جس مذہب نے اپنی کتاب اور اپنے بہترین اصول اپنے ماننے والوں سے نہ منوائے ہوں حتّٰی کہ اس کے بڑے بڑے پیرو کاروں کو ان اصول کو اصولوں کی فہرست سے خارج کرنا پڑا ہو اس کی نسبت انہی کے مقولہ کے مطابق کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ وہ علوم کی بڑھتی ہوئی رَو کی موجودگی میں لوگوں کے قلوب پر تصرف رکھ سکتا ہے ۔

ہندوؤں کا لاش دفن کرنا

ہندو مذہب میں لاش کا جلانا فرض ہے جس کی تائید میں پنڈت دیانند صاحب نے بہت سے دلائل بھی دیئے ہیں اور لاش کو دفنانے والوں پر تمسخر بھی اُڑایا ہے لیکن ہندوؤں میں سے جنگاما اور سنیاسی لوگ مردہ دفن کرتے ہیں یا جنگاما لوگ پانی میں لاش پھینک دیتے ہیں ۔ اب کیا اس قوم کا یہ طریق عمل جو ہندو مذہب کی ہدایات کے خلاف ہے کیا پروفیسر صاحب کے نزدیک اس امر کا ثبوت ہے کہ ہندو مذہب اب لوگوں کی تسلی کا موجب نہیں ہو سکتا ۔

ظاہر میں ہندو دل میں مسلمان

آنریبل مسٹر گوکل داس کے پریکھ لکھتے ہیں کہ مَیں بہت سے خاندان ایسے جانتا ہوں جو ظاہر میں ہندو ہیں لیکن دل میں مسلمان ہیں ۔ کیا ان کے اس بیان سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ زمانہ کی ترقی کے ساتھ

ہندو مذہب ترقی نہیں کر سکا کیونکہ اس کے ماننے والوں کو اس مذہب پر تسلی نہ ہوئی اور اپنے ضمیر کا مقابلہ نہ کر کے انہوں نے خفیہ طور پر اسلام کو قبول کر لیا۔

گو اس بات کا یہاں تعلق نہیں مگر مَیں ضمنی طور پر اس امر کے بیان کرنے سے نہیں رہ سکتا کہ آنریبل مسٹر گوکل داس صاحب کی یہ شہادت ہندو صاحبان کے اس اعتراض کا بھی قلع قمع کر دیتی ہے کہ اسلام تلوار سے پھیلا ہے۔ اس سے تو پتہ لگتا ہے کہ کئی خاندان دل سے اسلام لے آئے مگر وہ اپنے عقیدہ کو اپنے رشتہ داروں سے ڈر کر ظاہر نہیں کر سکے بلکہ یہ شہادت تو اس امر کا ثبوت ہے کہ اسلام کے اظہار کرنے میں لوگوں کو دقتیں ہوئی تھیں اور جبراً ان کو اس بات سے روکا جاتا تھا۔ تبھی تو کئی ہندو خاندانوں کو باوجود اسلام کی صداقت کا قائل ہو جانے کے اس کے اظہار کی جرأت نہیں ہوئی اور وہ اپنے ہم قوموں سے ڈر کر خفیہ خفیہ اسلام کی تعلیم پر عمل کرتے ہیں اور ظاہرہ طور پر ہندو بنے ہوئے ہیں۔

ویدوں کے متعلق چند اور آراء

اب مَیں پھر اصل مضمون کی طرف آتا ہوں۔ پنڈت درگا دتا جوشی صاحب لکھتے ہیں کہ ”ایک شخص خاص حد تک ویدوں کے علوم سے زیادہ علوم بھی حاصل کر سکتا ہے۔“ ان پنڈت صاحب کے بیان کے مطابق وید تمام علوم کا مخزن نہیں بلکہ ویدوں سے اوپر اور علوم بھی ہیں جو انسان حاصل کر سکتا ہے۔

راؤ بہادر دیوراڈ نایک صاحب کے نزدیک وید ہر زمانہ کے لئے کافی نہیں ہیں کیونکہ وہ لکھتے ہیں کہ یہ سچ ہے کہ اصلی ویدک تعلیمات اب رائج نہیں ہیں اور شاستر اور سمرتیاں لکھنے والے عقلمند لوگ تھے جنہوں نے اس زمانہ کی بدلی ہوئی حالت کے مطابق قواعد بنا دیئے۔

بابو گووندا داس صاحب کا خیال ہے کہ خدا تعالیٰ پر ایمان لانا ضروری نہیں کیونکہ یوگا کے سوا باقی پانچوں آستک خیالات کے سلسلہ خدا تعالیٰ کا ذکر تک نہیں کرتے۔

پروفیسر صاحب کونسی راہ اختیار کریں گے

ان حوالہ جات کے بعد مَیں نہیں سمجھ سکتا کہ پروفیسر صاحب ان دو راہوں کے سوا کسی تیسری راہ کو اختیار کر سکتے ہوں کہ یا تو وہ یہ اقرار کریں کہ جس دلیل کے ساتھ انہوں نے اسلام کے اثر کو ناقص ثابت کرنا چاہا تھا وہ دلیل درحقیقت دلیل نہیں ہے بلکہ ایک بات تھی جو لیکچر کو مزیدار بنانے کے لئے پیش کر دی گئی تھی اور صرف حاضرین کو خوش کرنا اس سے مقصود تھا اور یا یہ تسلیم کریں کہ وہ دلیل تو درست ہے گو اسلام کے خلاف وہ اس زور کے ساتھ پیش نہیں کی جا سکتی جس قدر کہ آریہ مذہب کے خلاف۔

اور قرآن کریم کے اثر کا نقص اس دلیل سے اس طرح ثابت نہیں ہوتا جس طرح کہ ویدوں کے اثر کا نقص۔

معلوم نہیں پروفیسر صاحب ان دونوں راہوں میں سے کونسی راہ اختیار کریں۔ مگر میں ان کو یہی مشورہ دونگا کہ جو سچی بات ہے وہ اسی کو قبول کرلیں کیونکہ آریہ سماج کے نیموں میں سے ایک یہ نیم بھی ہے کہ ستیہ کا گرہن کرنا اور استیہ کا چھوڑنا۔ اور سچی بات یہی ہے کہ یہ دلیل جو انھوں نے پیش کی تھی دلیل ہی نہیں ہے بلکہ ایک چٹکلہ ہے جو جہلاء کو خوش کرنے کے لئے پیش کیا جاسکتا ہے۔ اور میں اُن سے اُمید کرتا ہوں کہ وہ آئندہ اس قسم کے دلائل کو پیش نہ کیا کریں گے اور ایسے دلائل کو پیش کر کے ویدک مت کی صداقت کو ثابت کرنے کی کوشش کرینگے جو تنقید کو برداشت کرسکیں یا کم سے کم اس طرح بالبداہت باطل اور بے اصل نہ ہوں۔

بعض لوگوں کے کسی عقیدہ کے انکار کرنے کی وجوہات

گو یہ جوابات جو میں نے دیئے ہیں الزامی جوابات ہیں لیکن پروفیسر صاحب کے پیش کردہ دلائل کا جواب الزامی کے سوا اور کچھ ہو ہی نہیں سکتا۔ انھوں نے اپنے دعویٰ کی کوئی دلیل دی ہو تو اُسے رد کیا جائے۔ جن لوگوں کے اقوال انھوں نے نقل کئے ہیں ان کے دعوؤں کی بھی کوئی دلیل نہیں دی۔ پس ان پر بھی اس مضمون میں بحث نہیں کی جاسکتی۔ ہاں میں اس دلیل کے متعلق جو پروفیسر صاحب نے پیش کی ہے ان کی توجہ منعطف کرانی چاہتا ہوں۔ پروفیسر صاحب کو یاد رہنا چاہئے کہ کسی خیال یا عقیدہ کو بعض لوگوں کا نہ ماننا اس کے جھوٹے ہونے کی علامت نہیں ہوتا۔ لوگوں کا انکار ہمیشہ اس عقیدہ کے جھوٹا ہونے کا شاہد نہیں ہوتا بلکہ اس کی کئی وجوہ ہوتی ہیں۔

پہلی وجہ کبھی لوگوں کا انکار اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ گو وہ بات جس کا انکار کیا جاتا ہے سچی تھی مگر اس کے پیش کرنے والے قابل لوگ نہ تھے پس اس کے منکروں نے اپنی چکنی چپڑی باتوں سے لوگوں کو پھسلا لیا اور وہ منکر ہو گئے۔ چنانچہ پروفیسر صاحب اس امر کو تسلیم کرینگے کہ ان کے عقیدہ کے مطابق ویدک توحید پچھلے زمانہ میں ہندوستان سے اسی طرح مٹی تھی۔ پنڈت دیا نند صاحب سے پہلے ہندوستان میں بُت پرستی ہی ہندوؤں کا شعار تھا۔ پنڈت صاحب نے ہندوؤں میں ایک ایسی جماعت قائم کی جو ایک طرف بتوں سے بیزار تھی تو دوسری طرف الہام کی بھی قائل تھی۔ پنڈت صاحب کا یہ بھی عقیدہ تھا اور سب آریوں کا عقیدہ ہے کہ ویدوں میں توحید ہی کی تعلیم ہے اور پہلے

ہندو موحد ہؤا کرتے تھے۔ اب سوال یہ ہے کہ موحد ہندوستان مشرک کیونکر ہو گیا۔ آریہ صاحبان اس کا یہی جواب دینگے کہ آہستہ آہستہ لوگوں میں بدیاں پھیلتی گئیں اور سچی تعلیم کو وہ چھوڑتے چلے گئے۔ جس کے دوسرے لفظوں میں یہی معنے ہونگے کہ گو توحید کی تعلیم اصلی تھی مگر اس کے قائم رکھنے والے لوگ ایسے قابل نہ تھے کہ لوگوں کو اس پر قائم رکھ سکتے اور لوگ شرک کی طرف متوجہ ہو گئے۔ پس ایک وجہ کسی رائج عقیدہ یا خیال سے لوگوں کے منکر ہونے کی یہ ہوتی ہے کہ اس کے قائم رکھنے اور اس کی تبلیغ کرنے کے لئے لائق لوگوں کی کمی ہو جاتی ہے یا وہ بالکل مٹ جاتے ہیں۔

دوسری وجہ

دوسری وجہ کسی عقیدہ یا خیال کے ترک کرنے کی یہ ہوتی ہے کہ وہ لوگ جو منکر ہوتے ہیں اس کے تائیدی دلائل سُنے بغیر اس کے مخالفوں کی باتوں کو سنتے ہیں اور ان کی باتیں آہستہ آہستہ ان کے دل پر ایسا اثر کر جاتی ہیں کہ وہ مخالف خیالات ان کا اصل عقیدہ ہو جاتے ہیں اور جو ان کا آبائی عقیدہ تھا وہ ان کے نزدیک جدید خیالات کی طرح ہو جاتا ہے جس کو وہ تعصب کی وجہ سے نہ قبول کر سکتے ہیں اور نہ اس پر غور کر سکتے ہیں۔

تیسری وجہ

تیسری وجہ کسی عقیدہ کے ترک کرنے کی یہ ہوتی ہے کہ انسان اپنی کمزوری کی وجہ سے اس کے مطابق عمل نہیں کر سکتا اور اپنی اس کمزوری کے اظہار سے بھی شرماتا ہے۔ پس اپنے عیب کے چھپانے کے لئے وہ اس عقیدہ کا ہی انکار کر دیتا ہے۔

چوتھی وجہ

چوتھی وجہ کسی عقیدہ کے انکار کی یہ ہوتی ہے کہ بعض دفعہ انسان دوسروں کے رُعب میں آجاتا ہے اور بغیر اپنے خیالات کی صحت یا ان کی غلطی پر غور کرنے کے محض رعب کی وجہ سے ان کے خلاف بیان کرنے لگ جاتا ہے کیونکہ وہ یہ خیال کر لیتا ہے کہ کیا ایسے عقلمند لوگ غلطی کر سکتے ہیں۔

پانچویں وجہ

پانچویں وجہ کسی عقیدہ کے انکار کی یہ بھی ہوتی ہے کہ کوئی نیا علم ایسا دریافت ہوتا ہے جو اس کے خلاف نظر آتا ہے اور انسان خیال کر لیتا ہے کہ میرا عقیدہ اس علم کے مخالف ہے حالانکہ وہ علم ابھی ناقص ہوتا ہے اور بسا اوقات آئندہ تحقیقات اس بات کو ثابت کر دیتی ہیں کہ اس سے جو استدلال کیا گیا تھا وہ غلط تھا۔ چنانچہ ایسی بیسیوں باتیں ہیں کہ جن کو یورپ نے بعض جدید علوم کی بناء پر ترک کر دیا لیکن مزید تحقیقات سے ثابت ہؤا کہ ان کا استدلال غلط تھا اور اس ادھورے علم سے جو نتیجہ انہوں نے نکالا تھا اس کے کمل ہونے پر اس کی غلطی ان پر ثابت ہو گئی۔

چھٹی وجہ

چھٹی وجہ کسی عقیدہ کے انکار کی یہ ہوتی ہے کہ انسان اس عقیدہ کو باطل سمجھ کر نہیں بلکہ اور اغراض اور فوائد کی وجہ سے چھوڑ دیتا ہے۔ کبھی مال کے لالچ کی وجہ سے کبھی اس عقیدہ کے پھیلانے والوں سے جھگڑا ہو جانے کے سبب، کبھی عزت کی خاطر، کبھی دوستوں کو خوش کرنے کے لئے۔

ساتویں وجہ

ساتویں وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ واقعہ میں وہ عقیدہ جسے انسان ترک کرتا ہے غلط ہی ہوتا ہے اور انسان پر اس کی غلطی کھل جاتی ہے اس لئے وہ اس کا انکار کر دیتا ہے۔

پروفیسر صاحب نے نتیجہ نکالنے میں غلطی کی

غرض بعض لوگوں کے کسی عقیدہ یا مذہب کو ترک کر دینے سے یہی نتیجہ نہیں نکلتا کہ وہ عقیدہ یا مذہب ہی کمزور ہے بلکہ بسا اوقات اس ارتداد کا باعث اس عقیدہ کا غلط ہونا نہیں اس کا انکار کرنے والوں کی کمزوری یا کوتاہی یا بدنیتی یا غلطی ہوتا ہے۔ اور جب کسی مذہب سے پھرنے والوں کے اقوال کو اس مذہب کی کمزوری کے ثبوت میں پیش کیا جائے تو مدعی کا یہ بھی فرض ہوتا ہے کہ وہ ثابت کرے کہ یہ ارتداد اس مذہب کی کمزوری کے سبب سے ہے نہ کہ کسی اور سبب سے۔ مگر پروفیسر رام دیو صاحب نے ایسا نہیں کیا بلکہ چند لوگوں کے خیالات پیش کر کے جھٹ نتیجہ نکال لیا ہے کہ اسلام اس زمانہ کے لوگوں کی تسلی نہیں کر سکتا۔

مَیں نے یہ جوابات اس بات کو فرض کر کے دیئے ہیں کہ پروفیسر صاحب نے جو کچھ مسٹر خدا بخش صاحب اور سید امیر علی صاحب اور مسٹر مظہر الحق صاحب اور مسٹر یوسف علی صاحب کی نسبت لکھا ہے وہ درست ہی ہے لیکن مجھے یہ شبہ کرنے کی کافی وجہ ہے کہ ان لوگوں کے خیالات کے اظہار میں بھی پروفیسر صاحب کو غلطی لگی ہے۔ مگر چونکہ پہلے دو صاحبوں کی کتب اس وقت میرے پاس موجود نہیں ہیں اور دوسرے دو صاحبوں کی تقریر کا حوالہ پروفیسر رام دیو صاحب نے نہیں دیا اس لئے مَیں اس امر کی نسبت کچھ تحریر نہیں کر سکتا کہ جو کچھ انہوں نے ان صاحبان کی نسبت لکھا ہے وہ درست بھی ہے یا نہیں ہاں ان کو اس امر کے متعلق اپنا عقیدہ بتا دیتا ہوں۔

مَیں قرآن کریم پر عقلی یا نقلی اعتراض کرنیوالوں کو جواب دے سکتا ہوں

میرے نزدیک قرآن کریم خدا تعالیٰ کا کلام ہے اور اس کا ایک ایک لفظ اسی طرح محفوظ ہے جس طرح کہ وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہُوا اور یہ بات میں صرف

عقیدۃً ہی نہیں مانتا بلکہ اس بات پر مجھے کامل یقین ہے اور یہ یقین اس امر کا نتیجہ نہیں کہ مَیں مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہوا ہوں بلکہ اس یقین کی بناء دلائل اور عینی شواہد پر ہے اور مَیں اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہر اس شخص کے اعتراضات کا جواب دے سکتا ہوں جو قرآن کریم کے کلام الٰہی ہونے کا منکر ہو خواہ وہ اعتراضات عقلی ہوں یا نقلی۔

مَیں فرشتوں کے متعلق اعتراض کرنیوالوں کو جواب دے سکتا ہوں

اسی طرح میرا یہ یقین ہے کہ فرشتے خیالی یا وہمی وجود نہیں ہیں بلکہ ان کا وجود عالم خیال سے باہر بھی موجود ہے اور قرآن کریم نے فرشتوں کی نسبت جو کچھ بیان فرمایا ہے اس کا ایک ایک لفظ درست ہے اور اگر کسی شخص کو ان کے وجود کے خلاف کوئی اعتراض ہو تو مَیں اللہ تعالیٰ کے فضل سے اس کے شکوک کا ازالہ کر سکتا ہوں اور فرشتوں کا وجود میں صرف اس لئے ہی نہیں مانتا کہ مَیں نے قرآن کریم میں ان کا ذکر پڑھا ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کے محض فضل اور احسان سے مَیں نے خود بھی ان کی ملاقات کی ہے اور اُن سے کئی علوم سیکھے ہیں اور ان کا انکار ایسا ہی ہے جیسا کوئی نابینا سورج کی روشنی کا انکار کر دے۔ جب تک انسان کی رُوحانی آنکھیں نہ ہوں وہ کب اس بات کا اہل ہو سکتا ہے کہ روحانی وجودوں کو دیکھ سکے۔

رسول کریمؐ نے ایک آن کیلئے کسی کو اللہ کا شریک نہیں بنایا

میرا اس بات پر بھی یقین ہے کہ بعثت کے بعد تو الگ رہا بعثت سے پہلے بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آن کے لئے بھی اللہ تعالیٰ کا شریک کسی کو نہیں بنایا اور جو لوگ کہتے ہیں کہ آپ نے کبھی بھی مشرکوں کے کہنے سے ان کے تین دیوتاؤں کو مان لیا وہ تاریخ سے ناواقف اور حقیقت سے جاہل ہیں وہ اپنے دعویٰ کا ثبوت پیش کریں تو ہم باہر سے نہیں خود انکے دیئے ہوئے دلائل سے ہی ان کے دعویٰ کا باطل ہونا ثابت کر دیں گے۔ انشاء اللہ تعالیٰ

اسلام تمام دُنیا کیلئے ہے

مَیں اس بات پر بھی یقین رکھتا ہوں کہ اسلام عرب کے نیم وحشیوں کے لئے نہیں بلکہ دُنیا کے بہترین متمدن لوگوں کے لئے بھی مفید ہی نہیں بلکہ ضروری ہے اور مَیں ہر اس شخص کے اعتراضات کا جواب دینے کے لئے تیار ہوں جو اسلام کا حلقۂ اثر صرف نیم وحشیوں تک محدود رکھتا ہے۔ اسلام عملی طور پر یورپ اور ایشیاء کے متمدن ممالک یعنی یونان کے علاقوں ایران اور ہندوستان کی اصلاح کر کے ثابت کر چکا ہے کہ وہ تہذیب کا دعویٰ کرنیوالے ممالک کے لئے بھی ایسا ہی ضروری ہے جیسا کہ غیر متمدن لوگوں کے لئے اور اگر کسی کو عقلاً اس امر پر

کوئی اعتراض ہے تو وہ پیش کرے. اگر اس کے اعتراضات تنقید کی کسوٹی پر سچے ثابت ہوں تب جو چاہے دعویٰ کرے۔

اسلامی پردہ نیکی کے قیام کا بہترین ذریعہ ہے

مَیں اس بات پر بھی یقین کرتا ہوں کہ اسلامی پردہ نیکی اور تقویٰ کے قیام کے لئے بہترین ذریعہ ہے اور مَیں مشتاق ہوں کہ اس شخص کے دلائل سنوں جسے اس پر کوئی اعتراض ہو۔

مسئلہ کثرتِ ازدواج

مَیں کثرتِ ازدواج کا نہ صرف قائل ہوں بلکہ اس پر عامل ہوں. اور میرے نزدیک اسلامی احکام کے ماتحت ایک سے زیادہ نکاح کرنے نہ صرف یہ کہ زناکاری نہیں بلکہ اوّل درجہ کی بُردباری، قربانی، ایثار اور تقویٰ کی علامت ہے اور کوئی عیاش انسان ان قواعد کے ماتحت دوسرا نکاح کر ہی نہیں سکتا۔

صرف اللہ اللہ کرنا

خالی اللہ اللہ کا ذکر کرنا اسلامی تعلیم کے خلاف ہے اور اگر کوئی مسلمان ہندوؤں کی دیکھا دیکھی ایسا کرتا ہے تو وہ ایسا ہی ہے جیسے کئی ہندو مسلمانوں کی قبروں پر جاکر سجدہ کرتے ہیں۔

گوشت خوری

گوشت کو مَیں ان خوراکوں میں سے سمجھتا ہوں جو انسان کے لئے مضر نہیں بلکہ مفید ہیں اور اسلام نے جو اس کو حلال کیا ہے اس حکم کو مَیں نہایت ہی پُرحکمت سمجھتا ہوں اور جس شخص کو اس کے غیر قدرتی غذا ہونے کا خیال ہو اس کے دلائل معلوم ہونے پر اس کے اعتراضات کو وہم اور خیال ثابت کرنے کے لئے تیار ہوں۔ انشاء اللہ۔ اور جو شخص یہ کہتا ہے کہ گوشت انسان کی قدرتی غذا نہیں میرے نزدیک وہ ایسا ناواقف ہے کہ قدرتی غذا کے معنی بھی نہیں سمجھ سکتا۔ ہر وہ غذا جو غذا کا کام دے سکتی ہے اور انسان کے جسم کی نشوونما اس سے ہو سکتی ہے اور زہر نہیں ہے وہ قدرتی غذا ہے اس کو غیر قدرتی کہنا جاہل کا کام ہے۔ قدرتی کے یہ معنی نہیں ہیں کہ جس کے بغیر گذارہ نہ ہو سکے کیونکہ ایسی کوئی بھی غذا نہیں جس کے بغیر انسان زندہ نہ رہ سکے۔ بعض ممالک کی اصل غذا گیہوں ہوتی ہے، بعض دوسرے ممالک کے لوگ گیہوں کو اس طرح ہضم نہیں کر سکتے جس طرح چاول کو، بعض اور اقوام جوار کا زیادہ استعمال کرتی ہیں، بعض زیادہ تر گوشت، اور دودھ پر گذارہ کرتی ہیں۔ پس ایسی کوئی بھی غذا نہیں جس کے بغیر گذارہ ہی نہ ہو سکے اور اگر اس اصل سے کسی غذا کو قدرتی قرار دیا جائے تو کوئی غذا بھی قدرتی نہیں رہ سکتی۔

اور اگر گوشت کو قدرتی غذا نہ کہنے کی وجہ لوٹ کو ہنی کی یہ دلیل ہے کہ انسانی آنتیں گوشت خور جانوروں کی طرح نہیں ہیں تو یہ دلیل بھی باطل ہے کیونکہ انسان گوشت خور جانور نہیں ہے یہ خیال خود باطل ہے کہ ہر ذی روح کو یا گوشت خور ہونا چاہئیے یا سبزی خور۔ انسان نہ گوشت خور ہے نہ سبزی خور۔ اس کو اللہ تعالیٰ نے دونوں چیزیں استعمال کرنے کی طاقت دی ہے یہی وجہ ہے کہ یہ دونوں چیزوں کو ہضم کر لیتا ہے ورنہ وہ جانور جو صرف ایک چیز کھانے کی طاقت رکھتے ہیں دوسری چیز یا تو استعمال ہی نہیں کرتے یا اس کے استعمال سے ہلاک ہو جاتے ہیں یا متواتر استعمال سے ناکارہ ہو جاتے ہیں۔ پس گوشت کو غیر قدرتی غذا قرار دیکر اسلام پر حملہ کرنا نادانی کا فعل ہے۔

پرہیزگاری اسلامی احکام پر عمل کرنے سے حاصل ہوسکتی ہے

میرا یہ بھی یقین ہے کہ پُرانوں اور راماٗن کے پڑھنے سے نہیں بلکہ اسلامی احکام پر عمل کرنے سے سچی پرہیز گاری نصیب ہوتی ہے اور میں اس بات کا مشتاق ہوں کہ وہ باتیں معلوم کروں جو راماٗن میں ایسی موجود ہیں کہ جن سے پاکیزگی حاصل ہوتی ہے لیکن قرآن کریم اور احادیث اور اسلامی لٹریچر میں موجود نہیں۔ میرے نزدیک تو ہندوؤں کی ان مذکورہ بالا کتب میں ایسی کوئی بات نہیں مل سکتی جو پاکیزگی کا باعث ہو مگر اسلام میں موجود نہ ہو۔ ہاں ایسی باتیں ضرور مل جاویں گی جو ان کتب میں موجود ہیں اور خود ہندو صاحبان بھی دل سے یہی پسند کریں گے کہ کاش یہ نہ ہوتیں۔

پروفیسر صاحب اسلامی مسائل کے خلاف جو دلائل رکھتے ہیں۔ پیش کریں!

اپنے عقیدہ کے بیان کے بعد میں پروفیسر صاحب سے اُمید کرتا ہوں کہ یہ باتیں جو انھوں نے اسلام کی کمزوری ثابت کرنے کے لئے پیش کی ہیں ان کے متعلق اگر کوئی دلیل ان کے پاس ہے یا ان لوگوں کے پاس ہے جن کی مدد انہوں نے حاصل کی ہے تو اس کو پیش کریں۔ میں انشاء اللہ اس کا جواب دینے کے لئے تیار ہوں اور اس امر کو یقینی دلائل سے ثابت کرنے کے لئے تیار ہوں کہ علوم کی ترقی اور سائنس کے انکشافات اگر کسی مذہب کو نقصان نہیں پہنچا سکتے تو وہ صرف اسلام ہے یہی مذہب ہے جو ہر زمانہ کی ضروریات کو پورا کر سکتا ہے اور پورا کرتا رہے گا۔ تعجب ہے کہ پروفیسر صاحب کو وہ چند لوگ تو نظر آ گئے جو ان کے صوبہ سے باہر رہتے تھے اور جو اسلام کے بعض مسائل پر معترض تھے

اوراس سے انہوں نے یہ نتیجہ نکال لیا کہ اسلام ہر زمانہ کی ضرورت کو پورا نہیں کر سکتا لیکن ان کو وہ لوگ جو انہی کے صوبہ میں رہتے ہیں اور جو علی الاعلان اسلام کے ہر ایک حکم کی خوبی ثابت کرنے کے مدعی اور اس کی زندگی بخش قوت کے گواہ ہیں اور ان میں علوم جدیدہ کے ماہرین بھی شامل ہیں نظر نہ آئے۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

خاکسار

مرزا محمود احمد

ا۔ TOGO HEIHACHIRO (۱۸۴۷ء-۱۹۳۴ء) جاپانی امیر البحر اور انیسویں صدی کا ہیرو۔ جس نے جاپان اور روس کے مابین ۱۹۰۴ء '۱۹۰۵ء میں لڑی گئی جنگوں میں حصہ لیا اور خوب شہرت حاصل کی (اردو جامع انسائیکلوپیڈیا جلد ا صفحہ ۴۲۵ مطبوعہ لاہور ۱۹۸۷ء)

۲۔ HUXLEY, THOMAS HENRY (۱۸۲۵ء-۱۸۹۵ء) برٹش ماہر حیاتیات۔ جو ڈارون کا حامی تھا اس نے نظریہ ارتقاء اور سائنس کے دیگر مواضیع پر بحث کی ہے۔ (اردو جامع انسائیکلوپیڈیا جلد ۲ صفحہ ۱۸۵۶ مطبوعہ لاہور ۱۹۸۸ء)

۳۔ SPENCER, HERBERT (۱۸۲۰ء-۱۹۰۳ء) انگریز فلسفی جس نے علوم طبیعی اور نفسیات کے وسیع مطالعہ کے بعد تمام علوم کو متحد کرنے کے لئے ان پر نظریہ ارتقاء کا اطلاق کیا (اردو جامع انسائیکلوپیڈیا جلد ا صفحہ ۷۳۶ مطبوعہ لاہور ۱۹۸۷ء)

۴۔ MARCONI, GUGLIELMO (۱۸۷۴ء-۱۹۳۷ء) اطالوی موجد۔ جس نے ریڈیو' ٹیلی گرافی کا کامیاب نظام ایجاد کیا۔

۵۔ سمرتی۔ مجموعہ قوانین دھرم شاستر جو کہ اٹھارہ ہیں جن کو رکھیشروں نے احکام بید (وید) کے مطابق مرتب کیا ہے (لغت ہندی اردو صفحہ ۳۱۳ زیر لفظ "سمرتی" مطبع وندہ طلسمات فائن آرٹ پریس ۱۹۳۸ء)

کونسا مذہب دُنیا کی تسلّی کا موجب ہو سکتا ہے؟

پروفیسر رام دیو صاحب کے مضمون کا جواب

(از سیدنا حضرت خلیفۃ المسیح الثانی)

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ

خُدا کے فضل اور رحم کے ساتھ

ھُوَ النَّاصِرُ

احباب کرام کو یاد ہوگا کہ پروفیسر رام دیو صاحب کے ایک لیکچر کے متعلق جو انھوں نے آریہ سماج کے سالانہ جلسہ کے موقع پر دیا تھا اور جس میں انھوں نے ویدک دھرم کی فضیلت دوسرے مذاہب پر ثابت کرنے کی کوشش کی تھی میں نے ایک مضمون لکھا تھا جو ۱۳؍ دسمبر ۱۹۲۰ء کے الفضل میں شائع ہو چکا ہے۔

پروفیسر صاحب کے مضمون کا خلاصہ

پروفیسر رام دیو صاحب نے اس مضمون کا جواب پرکاش کے ۱۶؍ جنوری ۱۹۲۱ء کے پرچہ میں شائع کرایا ہے جس میں انھوں نے اول تو اس بات پر خوشنودی کا اظہار کیا ہے کہ ان کے مضمون پر سنجیدگی اور متانت سے نکتہ چینی کی گئی ہے پھر ہندو مسلم اتحاد پر میرے خیالات کی تائید کی ہے۔ آگے چل کر وہ تحریر فرماتے ہیں کہ میں نے غلط فہمی سے پروفیسر صاحب کی طرف یہ بات منسوب کر دی ہے کہ انھوں نے اسلام کے خلاف یہ دلیل دی ہے کہ مسلمانوں کا رنگ کالا ہے اس لئے وہ یورپ کی تسلی نہیں کر سکتے۔ وہ تحریر فرماتے ہیں کہ یہ بات انھوں نے عیسائیوں کے متعلق بطور مذاق کہی تھی اور "بندے ماترم" میں شائع شدہ خلاصۂ تقریر سے اس قسم کی غلط فہمی کا ہو جانا بعید از قیاس نہیں۔ پھر

وہ تحریر فرماتے ہیں کہ مسٹر سید امیر علی صاحب اور مسٹر خدا بخش کی کتابوں سے اقتباسات جس غرض سے پروفیسر صاحب نے پیش کئے تھے اس کا مطلب بھی میں غلط سمجھا ہوں وہ تسلیم کرتے ہیں کہ کسی مذہب کے پیروکار کا اس مذہب سے مُنکر ہو جانا لازمی طور پر اُس مذہب کے غلط ہونے کی دلیل نہیں لیکن اگر کسی مذہب کا پُرجوش واعظ اور مسلم لیڈر اس کتاب میں جو اس نے اس مذہب کی حمایت میں لکھی ہو اس کے کئی مسائل کو زمانہ کے لحاظ سے ناقابل حمایت تسلیم کرے تو یہ ان مسائل کی کمزوری کا ثبوت ضرور ہے۔ اگر ایک مقدمہ میں ایک فریق کا وکیل ہی خاص امر پر زور نہ دے یا اپنی کمزوری مان لے اور مؤکل اس کے نمائندہ ہونے سے انکار نہ کرے تو عدالت کے لئے ناممکن ہے کہ ان اُمور کے متعلق اس فریق کے حق میں فیصلہ کرے۔ سید امیر علی نہ مُرتد ہیں نہ معمولی مسلمان بلکہ انھوں نے یہ کتاب ہی اس غرض سے لکھی تھی کہ یورپ میں اشاعت اسلام ہو۔ پس جب ایک مسلمان عالم دنیا کو اسلام کی طرف کھینچنے کے لئے ایک کتاب لکھتا ہے اور اس میں یہ بتاتا ہے کہ اس کے بعض مسائل وحشیوں کے لئے تو مناسب تھے لیکن آج غیر ضروری ہیں تو اگر کوئی غیر مذہب کا واعظ اس سے یہ نتیجہ نکالے کہ کئی مسلمان عالم بھی اس روشنی کے زمانہ میں اسلام کے چند مسائل کی حمایت نہیں کر سکتے تو اس کا کیا قصور ہے۔ پھر لکھتے ہیں اس کے دو جواب ہو سکتے تھے یا یہ کہ سید امیر علی مُرتد ہیں یا یہ کہ حوالے غلط ہیں۔ مگر سید صاحب کو کسی نے کافر نہیں قرار دیا اور ان کے حوالوں کو کسی نے غلط ثابت نہیں کیا پس ان مسائل کا اسلام کی کمزوری کی دلیل میں پیش کرنا بالکل درست تھا۔ یہ میری دلیل تھی بھی اور ہے بھی کہ کسی مذہب کے نمائندوں کا باوجود کوشش کے اس کے بعض مسائل کی حمایت نہ کر سکنا اس مذہب کی کمزوری کی دلیل ہے۔

پھر پروفیسر صاحب لکھتے ہیں کہ ہندو صاحبان کے جو حوالے میں نے پیش کئے تھے وہ اپنے مُدعا کو ثابت کرنے سے قاصر ہیں۔ مثلاً لالہ لاجپت رائے صاحب کے اقوال اول تو کچھ ثابت ہی نہیں کرتے اور اگر ثابت کریں تو وہ آریہ سماجی نہیں ہیں پھر اگر انھوں نے یہ کہدیا کہ پندرہ سو برس سے بعض عقائد کی وجہ سے ہندو مذہب ہماری تباہی کا موجب ہو رہا ہے تو اس میں کیا حرج ہے اس کے تو سب ہندو قائل ہیں۔ لالہ مولراج صاحب بھی آریہ سماج کے مذہبی نمائندہ نہیں ہیں اور ان کے خیالات سے آریہ سماج کے دونوں فریق اختلاف ظاہر کر چکے ہیں نہ انھوں نے آریہ سماج کی حمایت میں کبھی کوئی کتاب لکھی ہے۔ آریہ گزٹ نے اگر گرے ہوئے لوگوں کیلئے ودھوا کے بیاہ کی اجازت دیدی ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ کیونکہ پنڈت دیانند صاحب نے بھی شودروں

کے لئے ودھوا بیاہ جائز قرار دیا ہے پس آریہ سماج کا کوئی نمائندہ آریہ اصول سے منحرف نہیں۔

پھر لکھتے ہیں کہ ہندو مذہب میں اختلاف کثیر کی موجودگی ویدک دھرم کے خلاف کوئی ثبوت نہیں ہے۔ کیونکہ ویدک دھرم ہندو دھرم نہیں بلکہ ایک عالمگیر دھرم ہے جو لوگ ویدوں کو نہیں مانتے اور جن کو ہندوؤں نے اپنا نمائندہ تسلیم نہیں کیا اور جنھوں نے ویدک دھرم کی تائید میں کوئی کتاب نہیں لکھی ان کا وید کے خلاف لکھنا ویدک دھرم پر کوئی حرف نہیں لاتا۔

آخر میں لکھتے ہیں کہ مَیں نے جو چیلنج ان کو دیا ہے کہ سید امیر علی صاحب نے اسلام کے جن مسائل کو ترک کر دیا ہے ان کے متعلق وہ مجھ سے بحث کر سکتے ہیں وہ اس چیلنج کو منظور کرتے ہیں اور اگر مجھے اعتراض نہ ہو تو سب سے پہلے قرآن کریم کے الہامی ہونے کے خلاف دلائل پیش کرنے کے لئے وہ تیار ہیں وہ مضامین پہلے اخبارات میں شائع ہو جاویں پھر کتابی صورت میں شائع ہو جاویں۔

رنگت کا سوال مذاق تھا

پروفیسر صاحب کے اس لیکچر کا خلاصہ جو انھوں نے آریہ سماج کے جلسہ پر دیا تھا اخبارات میں یہ دیا گیا تھا کہ اسلام آئندہ دنیا کا مذہب نہیں ہو سکتا کیونکہ ایک تو مسلمانوں کا رنگ سفید نہیں دوسرے خود بعض مسلمان مصنف اسلام کے بعض مسائل کو غلط اور ناقابل تسلیم تصور کرتے ہیں۔ ان دونوں سوالات میں سے پہلے سوال کے متعلق تو اپنے تازہ مضمون میں پروفیسر صاحب نے چونکہ تحریر فرما دیا ہے کہ وہ غلط فہمی سے پیدا ہؤا ہے اس لئے اس کے متعلق مزید بحث فضول ہے۔ دوسرا سوال باقی رہ جاتا ہے جسے انھوں نے پھر پیش کیا ہے اور اس کی صحت پر زور دیا ہے۔ پس مَیں اسی کے متعلق مزید روشنی ڈالوں گا۔ مگر پیشتر اس کے کہ مَیں ان باتوں کا جواب دوں جو پروفیسر صاحب نے اپنے دعویٰ کی تائید میں بطور تشریح یا بطور دلیل پیش کی ہیں مَیں یہ امر لکھ دینا مناسب سمجھتا ہوں کہ یہ امر میری سمجھ میں نہیں آیا کہ پروفیسر صاحب نے سوال اوّل کے متعلق غلط فہمی کو میری طرف کس طرح منسوب کیا ہے۔ غلط فہمی کے تو یہ معنے ہوتے ہیں کہ کسی عبارت کا جو اصل مطلب ہو اس کے خلاف دوسرا مطلب سمجھ لیا جائے اور یہ بات اس جگہ درست نہیں کیونکہ مَیں نے جو مفہوم "بندے ماترم" کا سمجھا ہے اس کے سوا اور کوئی مطلب اس کا نکل ہی نہیں سکتا پس اگر غلط فہمی تھی تو اس کا مرتکب "بندے ماترم" ہے نہ کہ مَیں۔ "بندے ماترم" ان کی تقریر کا خلاصہ ان الفاظ میں لکھتا ہے:۔

"مگر یہی سب کچھ نہیں کہ مسلمانوں کا رنگ سفید نہیں اس لئے یورپ کی مشکلات کا حل ان سے نہیں ہو سکتا۔"

پروفیسر صاحب فرماتے ہیں کہ انھوں نے یہ بات مسیحیوں کے متعلق مذاق کے طور پر کہی تھی۔ مگر سوال یہ ہے کہ اگر مسیحیوں سے مذاق کرنا تھا تو وہ اُس حصہ لیکچر میں ہونا چاہئے تھا جو مسیحیوں کے متعلق تھا نہ کہ اس حصہ میں جو مسلمانوں کے متعلق تھا اور پھر اگر مذاق ہی کرنا تھا تو انھوں نے کیوں یہ نہ کہا کہ ویدک دھرم سے بھی اس مشکل کا حل نہیں ہوسکتا کیونکہ اس کے پیروؤں کا رنگ سفید نہیں۔ ایک تیسری قوم کو کیوں بیچ میں لے آئے۔ مگر چونکہ وہ فرماتے ہیں کہ یہ مذاق تھا اس لئے میں بھی اس کو مذاق ہی تسلیم کرتا ہوں۔

اب رہا دوسرا سوال جو یہ ہے کہ چونکہ اسلام کے بعض پیرو اس کے بعض مسائل کو ضرورت کے مطابق نہیں بتاتے یا غلط قرار دیتے ہیں اس لئے اسلام اس زمانہ کی ضروریات کو پورا نہیں کرسکتا۔ اس کے متعلق اپنے تازہ مضمون میں پروفیسر صاحب نے کچھ تشریحات کی ہیں اور کچھ شرائط لکھی ہیں اور اس بات پر مُصر ہیں کہ یہ دلیل میری دُرست تھی۔ پروفیسر صاحب کے تازہ بیان کے مطابق اگر کسی مذہب کا مصنف پیرو جو اس مذہب کی حمایت کے لئے کھڑا ہو اور وہ اس مذہب کے بعض مسائل کو ناقابل حمایت ظاہر کرے اور دوسرے لوگ اس کو مُرتد قرار نہ دیں تو اس شخص کا یہ اقرار ضرور اس مذہب کے ان مسائل کے خلاف استعمال کیا جاسکتا ہے اور دو صورتوں میں سے ایک ضرور اختیار کرنی ہوگی یا اس شخص کو مُرتد ثابت کرنا ہوگا یا حوالہ جات کو غلط ثابت کرنا ہوگا۔

تصنیف کسی کو راہنما یا نمائندہ نہیں بنا دیتی

میرے نزدیک پروفیسر صاحب نے جو تشریح اپنی دلیل کی اب کی ہے اس سے بھی ان کا مُدعا ثابت نہیں ہوتا اور جو حوالے انھوں نے دیئے ہیں وہ بھی درست نہیں ہیں۔

پروفیسر صاحب کو معلوم ہونا چاہئے کہ تصنیف کسی کو رہنما اور مسلمہ لیڈر نہیں بنا دیتی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بڑے بڑے رہنما دُنیا میں گذرے ہیں لیکن انھوں نے خود کوئی تصنیف نہیں کی اور بعض ایسے لوگوں نے جو اہل نہ تھے تصانیف کردی ہیں۔ تصنیف تو ادبی مذاق یا جوشِ قلب پر دلالت کرتی ہے یا شہرت و نمود کی خواہش کی علامت ہے۔ پس سیّد امیر علی صاحب کا یا اور کسی کا کوئی کتاب لکھ دینا اسبات کی دلیل نہیں ہوسکتا کہ وہ مسلمانوں کے مسلمہ لیڈر ہیں۔ مسلمہ لیڈر تو وہ بھی ہوسکتے ہیں جب کوئی جماعت مسلمانوں کی ایسی موجود ہو جو اپنے آپ کو ان کی رائے سے متفق ظاہر کرتی ہو اور انکی اتباع کی مدعی ہو یا کم سے کم ان کو مذہبی طور پر کوئی رُتبہ دیتی ہو۔ مثلاً مذہبی مسائل میں ان کی رائے کو وقعت

دیتی ہو، ان سے مذہبی اُمور میں مشورہ لیتی ہو مگر یہ بات ہرگز ثابت نہیں نہ سید امیر علی صاحب، نہ مسٹر خدا بخش صاحب، نہ مسٹر مظہر الحق صاحب جن لوگوں کے اقوال یا تحریریں پروفیسر صاحب نے نقل کئے ہیں ان میں سے ایک شخص بھی ایسا نہیں جس کو تمام فرقہ ہائے اسلام تو الگ رہے کسی ایک فرقہ نے بھی کبھی ایک مذہبی عالم، واقف شریعت اور ماہر تسلیم کیا ہو۔ مثلاً سید امیر علی صاحب ہیں ان کی تمام تر عزت و شہرت ان کی قانونی قابلیت کی وجہ سے ہے یا سیاسی سعی کی وجہ سے اور اب تو مسلمان ان کو سیاسی لیڈر بھی تسلیم نہیں کرتے اور مسٹر خدا بخش صاحب کو کسی رنگ میں بھی مسلمانوں میں کوئی عظمت حاصل نہیں ہوئی اور دوسرے صاحبان جن کے آپ نے نام لکھے ہیں وہ خود آپ کے معیار کے مطابق بھی پورے نہیں اُترتے کیونکہ انہوں نے اسلام کی تائید میں کوئی کتاب نہیں لکھی۔ پس اگر یہ بات تسلیم بھی کرلی جائے کہ کسی مذہب کے کسی مقتدر عالم کا قول اس مذہب کے خلاف استعمال ہو سکتا ہے تو بھی ان لوگوں کے اقوال اسلام کے خلاف استعمال نہیں ہو سکتے کیونکہ یہ لوگ مذہبی عالم کبھی بھی تسلیم نہیں کئے گئے اور کبھی بھی مذہبی اُمور کے تصفیہ میں ان سے مشورہ نہیں لیا گیا۔ اگر ان میں سے بعض نے اسلام کے متعلق کتب بھی لکھی ہیں تو اس سے بھی یہ نتیجہ نہیں نکل سکتا کہ یہ اسلام کے عُلماء میں سے ہیں اور اس کے نمائندہ ہیں۔ نمائندہ تو دوسروں کے تسلیم کرنے سے ہوتا ہے نہ کہ کتاب لکھ دینے سے۔ اگر کوئی شخص آریہ مذہب کے متعلق کوئی کتاب لکھ دے تو کیا وہ اس کا نمائندہ کہلانے لگ جائے گا؟ کسی قوم کا نمائندہ تو وہی ہے جس کو وہ قوم خود اپنا نمائندہ مقرر کرے یا تسلیم کرے۔ ان لوگوں کو کب مسلمانوں نے اپنا مذہبی نمائندہ تسلیم کیا کہ ان کا قول اسلام کے خلاف حجت ہو۔

یہ بات بھی نظر انداز نہیں کرنی چاہئے کہ ان صاحبان کو اسلام کی تائید میں کتب لکھنے کے لئے اہل اسلام نے نہیں کہا کہ یہ کتب اہل اسلام کی طرف سے سمجھی جاویں نہ ان کی کتب کے شائع ہونے پر ان کو اسلام کی صحیح ترجمانی کرنے والا قرار دیا گیا ہے پس صرف اس وجہ سے کہ کسی شخص نے اسلام کی تائید میں کتاب لکھی ہے اس شخص کو اسلام کا نمائندہ نہیں قرار دیا جا سکتا اور نہ اس کی کتاب کو اسلام کی صحیح ترجمانی کہا جا سکتا ہے۔ خود آریہ سماج میں بیسیوں مصنف ہیں۔ پروفیسر صاحب کبھی جائز نہیں رکھیں گے کہ ان میں سے ہر ایک کو آریہ سماج کا نمائندہ قرار دیا جائے یا ان کی ذاتی رائے کو مدنظر رکھ کر آریہ سماج پر حملہ کیا جائے۔ رائے اسی شخص کی حجت ہو سکتی ہے جو کسی مذہب کا بانی ہو یا کسی جماعت نے خود اس کو اپنا نمائندہ منتخب کیا ہو یا اس کے رائے ظاہر کرنے کے بعد سب نے اس کے صحیح ہونے کی تصدیق کی ہو۔

کسی بات کی تردید نہ کرنا اسکو صحیح تسلیم کرنا نہیں ہوتا

پروفیسر صاحب کا یہ فرمانا بھی کہ لوگوں نے اُس کی تردید کیوں نہ کی۔ پس تردید نہ کرنا اور اس شخص کو مُرتد نہ قرار دینا اس امر کا ثبوت ہے کہ اس کو صحیح تسلیم کر لیا گیا درست نہیں۔ ہر مخالف رائے کا رد کرنا ضروری نہیں ہوتا نہ ہر بات جس کو رد نہ کیا جائے صحیح تسلیم کی جا سکتی ہے۔ اگر ہر ایک مخالف رائے کا رد کرنا ضروری ہو تو دُنیا میں اندھیر پڑ جائے اور اسقدر فضول تصنیف کرنی پڑے کہ جس کا اندازہ ہی نہیں کیا جا سکتا۔ کیا پروفیسر صاحب کہہ سکتے ہیں کہ آریہ سماج میں ہر اس بات کا جو ان کا کوئی ممبر غلطی سے کہہ بیٹھے رد کیا جاتا ہے اور اخبارات کے ایک ایک مضمون کو مدِنظر رکھا جاتا ہے۔ یہ دعویٰ دنیا کا کوئی مذہب بھی نہیں کر سکتا کہ اس کے افراد میں سے ہر ایک نے جو خیالات ظاہر کئے ہوں ان کا بالاستیعاب رد کیا جاتا رہا ہے۔ بیسیوں باتیں کئی وجوہ سے ناقابلِ التفات خیال کی جاتی ہیں اور بیسیوں تحریریں ان لوگوں کی نظر سے جو جواب دینے کی اہلیت رکھتے ہیں پوشیدہ رہتی ہیں پس انکار نہ کرنے کو ان کے مُسلّم ہونے کی دلیل قرار دینا بالکل غلط بات ہے۔ پروفیسر صاحب نے اس دلیل کی تائید میں ایک مثال دی ہے کہ اگر کسی شخص کا وکیل عدالت میں کوئی بات بیان کرے اور اس کا مؤکل اس کا انکار نہ کرے تو عدالت کے نزدیک وہ بات مؤکل ہی کی طرف سے سمجھی جائیگی۔ لیکن یہ مثال غلط ہے کیونکہ وکیل تو اس خاص کام کے لئے مؤکل مقرر کرتا ہے اور خود اسے اپنا کیس سمجھاتا ہے پھر اپنی یا اپنے کسی معتبر کی موجودگی میں اس سے کام لیتا ہے۔ یہاں ان میں سے کونسی بات پائی جاتی ہے۔ اگر مسلمانانِ عالم نے سید امیر علی صاحب یا کسی دوسرے مصنف کو اپنی طرف سے باقاعدہ مقرر کیا ہوتا تو تب بیشک بشرط علم ان پر لازم آتا کہ ان کی ہر ایک بات کو جو ان کے منشاء کے خلاف کہیں رد کریں لیکن جب یہ بات ہی نہیں تو پھر اس مثال سے پروفیسر صاحب کیا فائدہ حاصل کر سکتے ہیں۔

سید امیر علی صاحب کی کتاب کی تردید کیوں نہ ہوئی

پروفیسر صاحب کو یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ یہ کتاب انگریزی میں لکھی گئی ہے اور جس وقت یہ کتاب لکھی گئی ہے اُس زمانہ میں مختلف فرقوں کے وہ لوگ جو مذہب سے واقف تھے اس زبان سے ناواقف تھے اور نہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ کتاب اُن تک پہنچی تھی۔ پس ان امور کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کتاب یا اسی قسم کی اور کتب جو انگریزی میں لکھی گئی ہوں کی تردید نہ ہونا یا ان کے لکھنے والوں کے اسلام کے نمائندہ ہونے سے انکار نہ کیا جانا اس امر کا ثبوت

نہیں قرار پا سکتا کہ ان کا مضمون درست ہے یا یہ کہ وہ شخص ان لوگوں کا نمائندہ ہے۔
پروفیسر صاحب کو یہ بات بھی یاد رکھنی چاہئے کہ مسلمان ہمیشہ سے ان عقائد کے مخالف ہیں اور اس قسم کی کتب کے چھپنے کے بعد بھی مخالف رہے ہیں پس جب وہ مخالف خیالات کا اظہار کرتے رہے ہیں تو پھر کسی اور تردید کی ان کو کیا ضرورت تھی۔ ہر ایک عقلمند انسان خیال کر سکتا تھا کہ جب آپس میں اسقدر اختلاف رائے ہے تو ایک دوسرے کا نمائندہ کیونکر ہو سکتا ہے خصوصاً جبکہ خود مصنف کتاب نے اپنے نمائندہ ہونے کا دعویٰ نہیں کیا تو پھر باوجود مسلمانوں میں مخالف خیال کی موجودگی کے اس کی نمائندگی کا انکار کرنا ایک حماقت نہ ہوتی تو اور کیا ہوتا۔ اگر کوئی شخص ان کی نمائندگی کا انکار کرتا تو کیا سید امیر علی صاحب اس امر پر ہنستے یا نہ ہنستے اور کیا جواب میں یہ نہ کہتے کہ مَیں نے کب تمہارا نمائندہ ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔

مسلمانوں کا نمائندہ ہونے سے سید امیر علی صاحب کا انکار

مجھے تعجب ہے کہ پروفیسر صاحب سید امیر علی صاحب کو مسلمانوں کا نمائندہ قرار دے رہے ہیں اور سید امیر علی صاحب اپنی کتاب میں اس عہدہ سے انکار کرتے ہیں کیونکہ وہ متعدد جگہ لکھتے ہیں کہ اس وقت مسلمان اسلام کو چھوڑ بیٹھے ہیں اور صحیح اسلام ان میں نہیں پایا جاتا اور یہ کتاب جیسا کہ وہ خود اس کے دیباچہ میں لکھتے ہیں انھوں نے مسلمانوں کو بزعم خود حقیقی اسلام سمجھانے کے لئے لکھی ہے نہ کہ ان کی طرف سے نمائندہ کی حیثیت سے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:۔

"یہ کتاب جس کو پہلی کتاب کا دوسرا ایڈیشن کہنا غلط ہوگا خصوصیت کے ساتھ ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے لکھی گئی ہے۔"

پھر لکھتے ہیں کہ یہ کتاب انھوں نے اس اُمید سے لکھی ہے کہ:۔

"ہندوستان کے مسلمان اس بڑی یورپین طاقت کے زیر نگرانی دوبارہ عقلی اور اخلاقی زندگی حاصل کریں۔"

یہ عجیب قسم کا وکیل ہے جو اپنی تقریر کا مخاطب جج کی بجائے مؤکل کو بناتا ہے۔ سید صاحب کے یہ فقرات بتاتے ہیں کہ وہ اپنے آپ کو خود تراشیدہ جج خیال کرتے ہیں نہ کہ مسلمانوں کا وکیل۔

سید صاحب کی نمائندگی کا انکار کیا گیا

یہ بات بھی درست نہیں کہ سید صاحب کی نمائندگی سے انکار نہیں کیا گیا کیونکہ گو ان کا نام لیکر ان کو مخاطب نہ کیا گیا ہو مگر ان کے جن مضامین کی طرف پروفیسر صاحب نے اشارہ کیا ہے ان

کا رد واقف کاران اسلام کی طرف سے پچھلے تیس سال کے عرصہ میں ہمیشہ ہوتا رہا ہے۔ پس جب ان مضامین کو رد کیا جاتا رہا ہے تو یہی سید صاحب کے مذہبی نمائندہ ہونے کا رد ہے ان مضامین سے ایک بھی مضمون نہیں جس کا رد نہ کیا گیا ہو۔

مگر میں پروفیسر صاحب کے اس مطالبہ کو بھی کہ خاص اس کتاب کو مدنظر رکھ کر سید صاحب کی مخالفت کی گئی ہو پورا کئے بغیر آگے نہیں جانا چاہتا اور سید صاحب کی اپنی شہادت اس بارہ میں پیش کرتا ہوں اور بیان کا وہ فقرہ ہے جو ان کی کتاب کے دوسرے اڈیشن کے دیباچہ میں انھوں نے لکھا ہے وہ لکھتے ہیں:-

"وہ مخالفت جو اس کتاب کی ہوئی ہے اس نے یہ فائدہ ہی دیا ہے کہ وہ خیالات جو اس کے ذریعہ سے اگلی نسلوں میں پیدا کرنے مدنظر تھے ان کا اثر اور بھی بڑھ گیا ہے"

اس فقرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحب کی اس کتاب پر مخالفت کی گئی تھی پس پروفیسر صاحب کا یہ خیال بھی غلط ہو گیا کہ سید صاحب کی نمائندگی کا انکار کیوں نہیں کیا گیا۔ جیسا کہ سید صاحب تحریر فرماتے ہیں انکی کتاب کے شائع ہوتے ہی اسکے غلط خیالات کو رد کر دیا گیا تھا۔ پس ان کی نمائندگی کا انکار ہو چکا ہے۔ سید صاحب کے اس فقرہ سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے یہ کتاب بحیثیت نمائندہ اہل اسلام نہیں لکھی تھی بلکہ اپنے چند خیالات کو پھیلانے کے لئے یہ کتاب لکھی تھی۔ اگر پروفیسر صاحب کہیں کہ تمام اہل اسلام نے بالاتفاق اسکے نمائندہ ہونے سے انکار نہیں کیا تو میں پوچھتا ہوں کہ کیا لالہ مولراج صاحب کے اقوال کا رد ویدک دھرم کے ہر ایک ماننے والے نے استثناء کیا ہے۔ انکار کے لئے اسی قدر کافی ہوتا ہے کہ بعض لوگ اپنے اصل عقائد کا اظہار کر دیں اور نئے خیالات سے اپنی براءت کر دیں یہ ضروری نہیں ہوتا کہ ہر فرد ان کا انکار کرے اور یہ بات سید امیر علی صاحب کی کتاب سپرٹ آف اسلام کے متعلق خود ان کے اپنے بیان کے مطابق ہو چکی ہے۔

پروفیسر صاحب ایک اور دھوکے میں

پروفیسر صاحب ایک اور بہت بڑے دھوکے میں پڑے ہوئے ہیں اور وہ یہ کہ وہ ایک شخص کی غلطی سے تمام لوگوں پر حجت قائم کرنا چاہتے ہیں حالانکہ خواہ کوئی شخص کسی قوم کا نمائندہ بھی ہو اس کی بات کا اثر اس کے مخالف خیال کے لوگوں پر نہیں ہو سکتا۔ اگر فرض کر لیا جائے کہ جو شرائط پروفیسر صاحب نے بتائی ہیں وہ جس میں پائی جائیں اس کی بات اس کے ہم مذہبوں پر حجت ہوتی ہے تو بھی پروفیسر صاحب کی دلیل بالکل بے وزن ہے کیونکہ اسلام کی طرف منسوب ہونے والے اسوقت بیسیوں

فرقے ہیں۔ جس طرح وید کی طرف منسوب ہونے والے بیسیوں فرقے ہیں۔ پس اگر کوئی شخص ایک قوم کا نمائندہ بھی ہو تب بھی اس شخص کا قول زیادہ سے زیادہ اس کی قوم پر حجت ہوگا نہ کہ اس مذہب کے تمام پیروان پر خواہ وہ اس سے اختلاف ہی کیوں نہ رکھتے ہوں۔ چنانچہ خود پروفیسر صاحب اپنے مضمون میں اس امر پر بڑا زور دیتے ہیں کہ کوئی آریہ سماج کا نمائندہ آریہ سماج کے اصول سے منحرف نہیں ہے اور ہندو مذہب میں اختلاف ویدک دھرم کے خلاف دلیل نہیں ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ آریہ سماج کے سوا دوسرے ہندوؤں کے اقوال کو ویدک دھرم کے خلاف حجت نہیں سمجھتے حالانکہ وہ لوگ بھی وید کو مانتے ہیں۔ پس اگر وید کے ماننے والے مختلف فرقوں میں سے بعض لوگوں کا یہ تسلیم کرنا کہ وید سے بڑھ کر اور علوم بھی ہیں جن کو انسان حاصل کر سکتا ہے ویدک دھرم کے خلاف اس لئے دلیل نہیں کہ ان کا کہنے والا پروفیسر رام دیو صاحب کا ہمخیال نہیں۔ تو سوال یہ ہے کہ پھر کس سبب سے ایک ایسے شخص کا خیال جو زیادہ سے زیادہ اسلام کے کسی ایک فرقہ کا لیڈر کہلا سکتا ہے اسلام کے خلاف حجت قرار دیا جائے۔ اگر اس کا قول حجّت ہوگا تو پھر ویدوں کے ماننے والے فرقوں میں سے کسی ایک سربرآوردہ شخص کا قول بھی ویدک دھرم اور ویدک دھرم کے تمام ماننے والوں کے خلاف حجت ہوگا۔ اگر پروفیسر رام دیو صاحب کے نزدیک مسٹر تلک، پنڈت درگادتا جوشی اور راؤ بہادر دیو راؤ نایک صاحبان جیسے ویدک دھرم کے پیروؤں کے اقوال جو ویدک دھرم کے بعض اُصول کی کمزوری پر دلالت کرتے ہیں صرف اس وجہ سے قابل سند نہیں ہیں کہ یہ لوگ آریہ سماجی نہیں تھے تو میں پروفیسر صاحب سے سوال کرتا ہوں کہ کیوں سیّد امیر علی صاحب اور مسٹر خدا بخش صاحب کے ایسے اقوال جو اسلام کے خلاف ہوں اسلام کے خلاف استعمال کئے جا سکتے ہیں جبکہ اسلام میں بھی ویدک دھرم کے ماننے والوں کی طرح کئی فرقے ہیں۔ کیا ہم بھی پروفیسر صاحب کی طرح نہیں کہہ سکتے کہ اسلام کا کوئی شخص اسلامی اُصول سے اختلاف نہیں رکھتا کیونکہ احمدیوں میں سے کوئی شخص اسلامی اُصول سے اختلاف ظاہر نہیں کرتا۔ پروفیسر صاحب کے مضمون کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ آریہ سماج اور ویدک دھرم میں امتیاز نہیں کر سکے اور اسی طرح اسلامی فرق اور اسلام میں امتیاز نہیں کر سکے۔

غرض اگر پروفیسر صاحب کی بیان کردہ دلیل کو صحیح بھی تسلیم کر لیا جائے تو بھی وہ اسلام کے خلاف استعمال نہیں ہو سکتی کیونکہ نہ تو وہ لوگ جن کے حوالہ جات پروفیسر صاحب نے نقل کئے ہیں اسلام کے مذہبی نمائندہ ہیں اور نہ ان کو مسلمانوں نے کبھی مذہبی علماء میں شامل کیا ہے نہ ان لوگوں نے

مسلمانوں کی طرف سے مذہبی نمائندہ ہونے کا دعویٰ کیا ہے اور نہ ان کے مذہبی خیالات کو مسلمانوں نے کبھی صحیح تسلیم کیا ہے بلکہ وہ ہمیشہ ان کے خلاف عقیدہ رکھتے رہے ہیں اور ان کے خیالات کی عام طور پر بھی اور ان کی کتب کو مدنظر رکھ کر بھی تردید ہوتی رہی ہے۔ پس ان لوگوں کا بیان انہی کے خلاف تو دلیل ہو سکتا ہے باقی مسلمانوں یا اسلام کے خلاف کسی صورت میں بھی حجت نہیں ہو سکتا۔ اور اگر ان کا قول باوجود تمام مذکورہ بالا وجوہ کے اسلام کے خلاف حجت ہو سکتا ہے تو پھر بعض ہندو صاحبان کے وہ اقوال بھی جو میں نے اپنے مضمون میں لکھے ہیں ویدک دھرم کے خلاف ضرور استعمال ہو سکتے ہیں۔

پروفیسر صاحب کا پیشکردہ قاعدہ غلط ہے

اس وقت تو میں نے یہ بتایا ہے کہ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ جو اصل پروفیسر رام دیو صاحب نے قائم کیا ہے وہ درست ہے، تب بھی جن لوگوں کے اقوال سے پروفیسر رام دیو صاحب نے استدلال کیا ہے انکے اقوال خود انہی کے قائم کردہ اصل کے مطابق اسلام کے خلاف حجت نہیں۔ مگر اب میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ پروفیسر رام دیو صاحب نے جو قاعدہ بتایا ہے وہی غلط ہے۔ اوّل دلیل اس کے غلط ہونے کی یہ ہے کہ یہ بات ہی ناممکن ہے کہ کوئی شخص ایک تعلیم کو خدا تعالیٰ کی بتائی ہوئی بھی مانے اور پھر اس کے بعض حصوں کو کمزور بھی کہے کیونکہ اگر کوئی شخص خدا تعالیٰ کو مانتا ہے اور پھر اس بات پر بھی ایمان لاتا ہے کہ وہ بندوں کی ہدایت کے لئے کلام بھی کرتا ہے اور بعض خاص بندوں کو اپنی مرضی بتانے کیلئے چن لیتا ہے اور پھر ایک خاص تعلیم پر یقین رکھتا ہو کہ وہ خدا تعالیٰ کی طرف سے ہے اور اپنے بندوں کی ہدایت کے لئے اس نے خود نازل فرمائی ہے اور اس زمانہ کے لئے واجب العمل ہے تو یہ ممکن ہی نہیں کہ اس کے بعض حصوں کو وہ رد کر دے اور کہے کہ یہ ناقابلِ عمل ہیں۔ کیونکہ اس کے یہ معنے ہونگے کہ ایک شخص خدا تعالیٰ کو مانتے ہوئے یہ دعویٰ کرتا ہے کہ وہ خدا تعالیٰ سے زیادہ جانتا ہے اور خدا تعالیٰ کے بتائے ہوئے قانون سے بہتر قانون تجویز کر سکتا ہے اور اس قسم کا آدمی تجویز کرنا عقل کے خلاف ہے۔ کوئی عقلمند آدمی ایسا نہیں مل سکتا جو صدق دل کے ساتھ ایسا دعویٰ کر سکے اگر کوئی شخص اس قسم کا ملے تو وہ ضرور یا تو پاگل ہو گا یا نیم پاگل کہ وہ اپنے دعوٰے کے بالبداہت باطل ہونے کو سمجھ ہی نہیں سکتا یا فریبی ہو گا کہ ظاہر میں اپنے آپ کو ایک مذہب کا پیرو قرار دیگا لیکن باطن میں اس کی بیخکنی کرنے کے درپے ہو گا اور دوست بن کر اس سے دشمنی کرنا چاہے گا اور ان دونوں صورتوں میں اس کے قول کو دوسروں پر حجت نہیں قرار دیا جا سکتا۔ کیونکہ اگر وہ پاگل ہے تب بھی

اس کی بات کسی پر حجت نہیں اور اگر وہ جھوٹا ہے تب بھی اس کی بات کسی کے خلاف دلیل نہیں کیونکہ اس صورت میں یہ نمائندہ نہیں بلکہ دشمن ہے اور دشمن کا قول کسی پر حجت نہیں ہوا کرتا۔ پس ان شرائط کا آدمی فرض کرنا جو پروفیسر صاحب نے پیش کیا ہے محال ہے اور ناممکن ہے اور جب ایسا آدمی ہو ہی نہیں سکتا تو پھر اس قسم کے آدمی کا وجود فرض کر کے اس کے قول کو حجت قرار دینا ایک غلط راہ ہے کیونکہ جب بنیاد ہی مفقود ہے تو اس پر عمارت کیونکر کھڑی کی جا سکتی ہے۔

عدالتی وکیل اور مذہبی نمائندہ میں فرق

پروفیسر صاحب نے عدالتی مقدمات پر قیاس کر کے فرض کر لیا ہے کہ مذاہب کی جنگ میں بھی ایسے آدمی کا وجود ممکن ہے حالانکہ مقدمات میں وکیل خود فریق مقدمہ نہیں ہوتا بلکہ ایک تیسرا شخص ہوتا ہے جو وکالت کسی اپنے یقین اور وثوق پر نہیں کرتا بلکہ روپیہ لیکر بطور مزدور کے کام کرتا ہے اور مذاہب کے وکیل ایسے نہیں ہوتے۔ بلکہ کسی مذہب کے وکیل ہونے کے یہ معنے ہیں کہ وہ سب سے زیادہ اس مذہب پر یقین رکھتا ہے اگر وہ یقین رکھتا ہے تو اس کی نسبت یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ بعض مسائل کو غلط قرار دیتا ہے اور اگر وہ بعض مسائل کو غلط قرار دیتا ہے تو پھر وہ اس مذہب کا وکیل نہیں کہلا سکتا۔ ہاں یہ بیشک ہو سکتا ہے کہ ایک مباحثہ ہو اور اس میں ایک شخص کسی مذہب کی طرف سے وکیل ہو کر پیش ہو اور دوران بحث میں اس کو اپنے دعویٰ کا بطلان ثابت ہو جائے اور وہ اقرار کرے کہ جس مذہب پر مَیں تھا وہ باطل تھا۔ مگر یہاں کسی بحث کے بعد اقرار کر لینے کا سوال نہیں بلکہ یہ سوال ہے کہ ایک شخص اپنے طور پر کتاب لکھنے لگا ہے اور اس میں لکھتا ہے کہ جس مذہب پر مَیں ہوں اس کے بعض مسائل کمزور ہیں۔ پس جب یہ شخص پہلے سے ہی اس مذہب کی کمزوری کا یقین رکھتا تھا تو پھر اس کی طرف سے وکالت کرنے کے لئے کس طرح کھڑا ہو سکتا تھا اور ایسے شخص کو کون عقلمند اس مذہب کا وکیل کہہ سکتا ہے۔

دوسرا فرق مقدمات کے وکلاء اور مذہبی وکلاء کے درمیان یہ ہوتا ہے کہ مقدمات کے فریق انسان ہوتے ہیں اور ان کی نسبت امکان ہوتا ہے کہ وہ جھوٹ بول دیں یا غلطی کر دیں اور یہ بھی ممکن ہوتا ہے کہ کچھ حصہ ان کے بیان کا غلط یا جھوٹ ہو اور کچھ حصہ درست اور سچا ہو اور یہ ممکن ہے کہ ایک وکیل پر دوران مقدمہ میں اپنے مؤکل کے بیان کے کسی حصہ کی کمزوری ثابت ہو اور وہ اس کا اقرار کر لے لیکن جس تعلیم کی بنیاد اس پر ہو کہ وہ خدا تعالیٰ کی طرف سے ہے اس کے کسی حصہ کے رد کر دینے

کے معنے یہ ہیں کہ وہ مذہب خدا تعالیٰ کی طرف سے نہیں اور جھوٹا ہے پس جو شخص کسی مذہب کے بعض حصوں کو رد کرتا ہے وہ درحقیقت اس سارے مذہب کو رد کرتا ہے اور جو شخص کسی مذہب کو جھوٹا سمجھتا ہے وہ اس کی طرف سے وکیل کیونکر کہلا سکتا ہے۔ پس مقدمات پر مذہبی وکالت کا قیاس کرنا بالکل غلط اور خلاف عقل ہے۔

مذہب کے کسی حصہ سے انکار اس مذہب سے نکلنا ہے

کسی تعلیم کے بعض حصوں کو رد اور بعض حصوں کو تسلیم اسی صورت میں کیا جا سکتا ہے جبکہ اس کو انسانی قرار دیا جائے۔ جیسا کہ فلسفیانہ خیالات کے پیرو ہوتے ہیں کہ وہ بعض دفعہ ایک خاص جماعت فلاسفہ میں داخل ہوتے ہیں لیکن ان کے بعض خیالات کے منکر ہوتے ہیں اور اس سے اُن پر خلاف عقل کام کرنے کا الزام نہیں آ سکتا کیونکہ وہ ان خیالات کو انسانی سمجھتے ہیں اور اکثر کو مان کر کچھ حصہ کا انکار کر کے بھی اس حلقہ میں داخل رہ سکتے ہیں لیکن مذہب میں یہ بات ناممکن ہے۔ مذہب کے ایک شوشہ کو بھی اگر کوئی شخص یہ کہہ کر رد کرتا ہے کہ ہے تو یہ مذہب کا جزو لیکن ہے غلط۔ وہ عقلاً اسی وقت اس مذہب سے نکل جاتا ہے اور اس مذہب کا وکیل نہیں کہلا سکتا اور عقل اس بات کو تسلیم نہیں کر سکتی کہ وہ اس مذہب کی صداقت ثابت کرنے کے لئے تصانیف کریگا۔

مذہب کو بطور تمدن ماننے والے

ہاں ایک اور صورت بھی ہوتی ہے اور وہ یہ کہ بعض لوگ ایک مذہب کو جھوٹا سمجھتے ہیں لیکن اس تمدن کے عادی ہونے کے سبب سے جو اس مذہب کے اردگرد جمع ہو گیا ہے یا بعض اور دنیاوی اغراض کے ماتحت ظاہر میں اس سے انکار نہیں کر سکتے بلکہ اس تمدن کے عادی ہونے کے سبب سے جو اس مذہب کے پیروان میں قائم ہو چکا ہے اس نظام کا ٹوٹنا بھی پسند نہیں کرتے اور یہ دیکھ کر کہ اگر اس مذہب کو کوئی نقصان پہنچا تو یہ تمدن بھی ٹوٹ جائیگا جو اس کا جزو اور حصہ ہو چکا ہے وہ مذہب پر حملہ ہوتے ہوئے دیکھ کر اس مذہب کی حمایت بھی شروع کر دیتے ہیں لیکن اس سے ان کی غرض مذہب کا بچانا نہیں ہوتا بلکہ اس تمدن کا بچانا ہوتا ہے جسے اس کی اصل شکل میں یا ایک قلیل تغیر کے ساتھ وہ قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی حمایت بیشک چونکہ بے اُصولے پن کے سبب سے ہوتی ہے ان کی باتوں میں اختلاف اور کمزوری پائی جاتی ہے کیونکہ اس مذہب کو خدا کی طرف سے یقین نہ کر کے اس کی اصلی شکل کا قیام ان کے نزدیک ضروری نہیں ہوتا۔ وہ اس کو صرف

ایک نام سمجھتے ہیں، جس نے ایک خاص جماعت کو دوسرے لوگوں سے علیحدہ کر کے ان کی ہستی کو ایک خاص تمدن کے ساتھ قائم رکھا ہؤا ہوتا ہے۔ مسیحیوں میں ایسے لوگ کثرت کے ساتھ پائے جاتے ہیں اور یہ لوگ صاحب تصنیف بھی ہوتے ہیں اور مسیحیت پر حملہ کے وقت پادریوں کے ساتھ شامل ہو جاتے ہیں اور دوسرے مذاہب کو مٹانے میں ان کی مدد بھی کرتے ہیں لیکن ان کو مسیحیت سے کوئی پیار نہیں ہوتا نہ وہ اس کو سچا یقین کرتے ہیں لیکن وہ یہ جانتے ہیں کہ صدیوں کے اثر سے مسیحیوں میں ایک خاص تمدن پیدا ہو گیا ہے جس کے وہ عادی ہو چکے ہیں اگر مسیحیت تباہ ہوئی اور اس کی جگہ کوئی دوسرا مذہب قائم ہؤا تو وہ اپنا تمدن ساتھ لائے گا اور اس سے ان کی زندگی پر بھی اثر پڑے گا یا اس سبب سے نہیں بعض اور اسباب دنیاوی کے سبب سے وہ اس حلقہ کا ٹوٹنا پسند نہیں کرتے۔ پس وہ باوجود اس مذہب سے متنفر ہونے کے سوسائٹی کو بچانے کے لئے مسیحیت کی مدد کرتے ہیں چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اسی سبب سے نہ کسی مذہبی تعصب کے سبب سے ایسے لوگ ترکوں کے خلاف پادریوں کے ساتھ مل جاتے ہیں۔ ان کو مسیحیت سے محبت نہیں ہوتی بلکہ اسلام کا جو اثر تمدن پر ان کے نزدیک پڑ سکتا ہے وہ اسے ناپسند کرتے ہیں پس اس کو مٹانا چاہتے ہیں۔ بعض ایسے لوگ مسلمانوں میں بھی ہیں اور ہندوؤں میں بھی ہیں۔ صرف ایک ہماری جماعت ایسی ہے کہ جس میں ایسے لوگ یا تو بالکل نہیں یا بالکل شاذ ہیں اور وہ بھی ایسے نہیں کہ جو علمی یا عملی حصہ میں کوئی وقار رکھتے ہوں۔

ایک مثال

مجھے اس قسم کی ایک مثال یاد آگئی ۱۲ء میں میں مصر گیا تھا راستہ میں میرے ہم سفر ہندوستانیوں میں سے ایک ہندو صاحب لاہور کے باشندہ تھے جو اب سنا ہے ایک کامیاب بیرسٹر کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔ یہ صاحب اس وقت بیرسٹری کی تعلیم حاصل کر رہے تھے اور چند ماہ کے لئے گھر آئے ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ دو مسلمان طالب علم بھی تھے کہ وہ بھی ہندوستان رشتہ داروں سے ملنے کے لئے آئے تھے اور کچھ ماہ میں تعلیم سے فارغ ہونے والے تھے۔ ہمارے جہاز میں ایک پادری صاحب بھی تھے ان کے ساتھ ان ہندو صاحب کی ایک دن بحث ہو گئی اور ان صاحب نے خوب زور سے پادری صاحب پر یہ بات ثابت کرنی چاہی کہ ہندو مذہب ہی مکمل مذہب ہے اور مسیحیت اس کے مقابلہ میں کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ اس کے ایک یا دو دن کے بعد ان کی مجھ سے گفتگو ہوئی اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کی ہستی کا تمسخر آمیز طریق پر انکار کیا۔ میں نے ان کو وہ گفتگو یاد دلائی جو انہوں نے پادری سے کی تھی تو وہ ہنس پڑے اور کہنے لگے کہ وہ تو ایک مقابلہ کی صورت تھی۔ پادری اس مذہب پر حملہ کرتا تھا جس

کے ماننے والے میرے آباء و اجداد تھے اور جس کی طرف میں خود منسوب ہوں اس لئے میں اس سے بحث کرتا تھا اور ہمیشہ اس کے لئے تیار ہوں۔ مگر اس وقت پرائیویٹ گفتگو ہے میں تو خدا (تعالیٰ) کو ہرگز نہیں مانتا میرا مذہب صرف قومیت ہے ان مذاہب نے ہماری ترقی کو روک دیا ہے۔ بعد میں مجھے معلوم ہؤا کہ مسلمان صاحبان بھی اسی خیال کے آدمی تھے گو جہاز سے میرے اُترنے سے پہلے پہلے میں سمجھتا ہوں اور جیسا کہ ان میں سے بعض نے ذکر بھی کیا ان کے خیالات میں ایک حد تک اصلاح ہو چکی تھی۔

غرض اس قسم کے آدمی ہوتے ہیں اور وہ مذہب کے مقابلہ میں حصہ بھی لے لیتے ہیں لیکن وہ مذہبی نمائندہ ہرگز نہیں کہلا سکتے۔ اور یہ بات عقلاً ناممکن ہے کہ کوئی شخص صدق دل سے ایک مذہب کو خدا تعالیٰ کی طرف سے مانے اور پھر اس کے بعض حصوں کو ناقابل عمل یا ناقص یا باطل سمجھے۔

صرف کسی کے کہدینے سے کوئی مسئلہ کمزور نہیں ہو سکتا

دوسری دلیل پروفیسر رام دیو صاحب کے بتائے ہوئے معیار کے غلط ہونے کی یہ ہے کہ اگر بفرض محال یہ مان بھی لیا جائے کہ مذہب کا نمائندہ بھی ایک ایسا شخص ہو سکتا ہے جو اس کے بعض حصوں کو غلط قرار دے اور عارضی طور پر تسلیم کر لیا جائے کہ یہ بات ممکن ہے کہ ایک شخص کسی تعلیم کو خدا تعالیٰ کی طرف سے بھی مانتا ہو اور پھر اس کے بعض حصوں کو غلط بھی جانتا ہو تو بھی ایسے فرضی آدمی کے بعض مسائل کو رد کر دینے سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ وہ مسائل کمزور ہیں اور بودے ہیں۔ کیونکہ دوسرے کا قول اس جگہ کسی امر کو مشتبہ کیا کرتا ہے جہاں وہ چیز نظروں سے پوشیدہ ہو مثلاً کچھ تاجر کسی جگہ سے مویشی لادیں اور یہ ظاہر کریں کہ مثلاً فی مویشی ان کو دو دو سو روپیہ پر پڑا ہے لیکن ان میں سے کوئی شخص یا ان کی دکان کا مینجر خریدار سے کہدے کہ اصل خرید تو سو روپیہ فی مویشی کی ہے تو گو یہ ممکن ہے کہ وہ کسی مخفی سبب سے اپنے ساتھیوں یا اپنے مالکوں کو نقصان پہنچانے کے لئے جھوٹ بول رہا ہو لیکن خریدار کو شک پڑ جاتا ہے کہ شاید یہ بات سچ ہی ہو لیکن وہ حصہ دار یا مینجر اگر مثلاً ایک بیل کی نسبت یہ کہدے کہ میاں یہ بیل نہیں ہے بلکہ سچ پوچھو تو یہ گدھا ہے تو کیا پھر بھی خریدار کو شک پڑ جائے گا اور وہ کہے گا کہ یہ ایک حصہ دار کی رائے ہے یا مینجر کی بتائی ہوئی بات ہے ضرور کوئی بات ہو گی۔ اس شخص کا ایسی بات کہنا دو حال سے خالی نہ ہو گا یا کہنے والا پاگل ہو گا یا دوسروں کو پاگل سمجھتا ہو گا پس شہادت اس امر کے متعلق ہؤا کرتی ہے جو بات نظروں سے اوجھل ہو

نمائندہ ہو یا غیر نمائندہ اس کی بات تبھی قابل سماعت ہوگی جب کسی ایسے امر کے متعلق کہے جو نظروں سے اوجھل ہو لیکن جو بات عقل کے ساتھ تعلق رکھتی ہے اور دلائل کے ساتھ ثابت کی جاتی ہے اس کے متعلق کہنا کہ فلاں شخص یوں کہتا ہے کس قدر عجیب بات ہے۔ ایسی باتیں جو معقولات میں سے ہیں اور جن کی صداقت یا بُطلان دلائل عقلیہ سے ثابت کیا جاتا ہے نہ کہ روایت سے ان کے متعلق تو دس کروڑ انسان بھی کہدیں کہ وہ غلط ہیں تو ان کے کہنے کا کچھ اثر انکی صداقت پر نہیں پڑ سکتا۔ اگر کوئی شخص ان کو غلط ثابت کرنا چاہتا ہے تو اس کا ایک ہی فرض ہے کہ وہ دلائل و براہین کیساتھ ان کو غلط ثابت کردے۔ ایسے امور میں دوسروں کے اقوال پر اپنی دلیل کا انحصار رکھنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کے بیوہ ہو جانے پر اس لئے یقین کر لیا تھا کہ قاضی کی مہر لگا ہؤا خط اُس کے پاس پہنچا تھا کہ اس کی بیوی بیوہ ہو گئی ہے۔ جب وہ مسائل جن پر اعتراض کیا گیا ہے عقلی ہیں تو ان کے غلط ثابت کرنے کا یہ طریق ہے کہ دلائل کے ساتھ ان کو غلط ثابت کیا جائے نہ کہ زید و بکر کے قول سے ان کے خلاف حجت پکڑی جائے۔ صداقت ساری دنیا کے انکار سے صداقت ہی رہے گی اور جھوٹ ساری دُنیا کی تصدیق سے بھی جھوٹ ہی رہے گا۔ پس کسی بات کے جھوٹا ثابت کرنے کا ایک ہی حقیقی ذریعہ ہے کہ دلائل سے اس کے جھوٹا ہونے کو ثابت کر دیا جائے۔

پروفیسر صاحب کے پیش کردہ حوالے

تیسرا جواب پروفیسر رام دیو صاحب کے مضمون کا یہ ہے کہ انہوں نے چار مسلمانوں کے اقوال پیش کئے ہیں۔ سید امیر علی صاحب، خدا بخش صاحب، یوسف علی صاحب اور مسٹر مظہر الحق صاحب۔ یوسف علی صاحب تو کوئی ایسے غیر معروف آدمی ہیں اور ان کا فقرہ ایسا مہمل ہے کہ اس سے تو کوئی نتیجہ ہی نہیں نکلتا۔ مسٹر مظہر الحق صاحب نے گوشت کو غیر قدرتی غذا کہا ہے اور یہ خود ایک مبہم فقرہ ہے کیونکہ انسان کی کوئی خاص غذا نہیں ہے اور نہیں کہہ سکتے کہ انہوں نے کن معنوں میں یہ فقرہ استعمال کیا تھا اور اگر ان کے فقرہ کے سخت سے سخت معنے بھی کر لئے جاویں تو بھی ایک طبی مسئلہ سے زیادہ اس کو وقعت نہیں دی جاسکتی اور اس کے یہی معنے لئے جاسکتے ہیں کہ گوشت کوئی اعلیٰ درجہ کی غذا نہیں اور اس سے اسلام کے زمانہ حال کے لئے ناکافی ہونے کا ہرگز ثبوت نہیں نکلتا۔

اب دو شخص باقی رہ جاتے ہیں ایک سید امیر علی صاحب اور دوسرے مسٹر خدا بخش صاحب مسٹر خدا بخش صاحب کی جس کتاب میں قرآن کریم کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ڈائری قرار دیا گیا ہے اس

کا حوالہ چونکہ پروفیسر رام دیو صاحب نے نہیں دیا اس لئے مَیں اس کے متعلق کچھ نہیں لکھ سکتا۔ ہاں سید امیر صاحب کی کتاب سپرٹ آف اسلام کے جن تین حوالوں کو انہوں نے پیش کیا ہے ان کے متعلق میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ دُرست نہیں ہیں۔

رسول کریمؐ کے متعلق سید امیر علی صاحب نے نہیں لکھا کہ آپ نے بُتوں کو مان لیا

ایک حوالہ جو سپرٹ آف اسلام سے پروفیسر رام دیو صاحب نے دیا ہے یہ ہے کہ سید امیر علی صاحب نے لکھا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کفارِ مکہ نے کہا کہ وہ ان کے تین بُتوں کو مان لیں تو وہ بھی ان کے خدا کو مان لینگے تو آپ نے کچھ دن کے لئے بُتوں کو مان لیا۔

مجھے نہایت افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ سید امیر علی صاحب پر یہ اتہام ہے ان پر اور ہزار الزام لگ سکتے ہوں مگر یہ الزام ان پر نہیں لگ سکتا۔ انہوں نے ہرگز اپنی کتاب میں یہ نہیں لکھا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کفار کے کہنے پر بُتوں کو مان لیا تھا بلکہ اس مضمون پر انہوں نے اپنی طرف سے کچھ لکھا ہی نہیں۔ یہ واقعہ جس کی طرف پروفیسر رام دیو صاحب نے اشارہ کیا ہے سپرٹ آف اسلام کے پہلے باب میں مندرج ہے۔ سید امیر علی صاحب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے حالات بیان کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں کہ:۔

"اس دوران میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جسے پیغمبر صاحب کے مسیحی سوانح نویس اور مسلمان مؤرخ مختلف پیرایوں میں بیان کرتے ہیں۔"

اس کے آگے انھوں نے پہلے تو اسلامی مؤرخین کی روایت نقل کی ہے اور بعد میں مسیحی مؤرخوں کا وہ بیان نقل کیا ہے جس کی طرف پروفیسر رام دیو صاحب نے اشارہ کیا ہے اور جسے انہوں نے سید امیر علی صاحب کی طرف منسوب کیا ہے اپنی طرف سے سید صاحب نے کوئی رائے ظاہر نہیں کی۔ چنانچہ سید صاحب لکھتے ہیں کہ "دو مسیحی مؤرخین کے نزدیک اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریمؐ کے دل میں ایک قلیل عرصہ کے لئے یہ خواہش پیدا ہو گئی تھی کہ وہ قریش کے ساتھ جو جنگ ہو رہی تھی کسی سمجھوتہ کے ذریعہ خاتمہ کر دیں۔" اور آگے انھوں نے مسیحی مؤرخین کے دونوں گروہوں کے خیالات نقل کئے ہیں۔ ان کے بھی جو متعصب ہیں اور ان کے بھی جو غیر متعصب ہیں جیسے لین پول وغیرہ۔ پس مسیحی مؤرخین کے خیالات کو سید امیر علی صاحب کی طرف منسوب کرنا ایک ظلم عظیم ہے اور مجھے افسوس ہے کہ ایک قابل آدمی کی زبان سے اس قسم کی غلطی کی اشاعت ہو اور ایک ایسے مضمون کے بیان کرتے

وقت جس میں وہ ایک اہم اور وسیع الاثر مسئلہ کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کر رہا ہو۔

فرشتوں کے متعلق حوالہ بھی غلط پیش کیا گیا

دوسرا حوالہ فرشتوں کے متعلق ہے۔ پروفیسر رام دیو صاحب فرماتے ہیں کہ سید امیر علی صاحب نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ قرآن میں فرشتوں کا جو ذکر ہے وہ صرف محمد صاحب کا وہم اور شاعرانہ نازک خیالی تھی ورنہ فرشتے درحقیقت کوئی چیز نہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ اس حوالہ کے بیان کرنے میں بھی پروفیسر صاحب نے غلطی کی ہے اور جلد بازی سے کام لیا ہے۔ سید امیر علی صاحب نے اپنی کتاب سپرٹ آف اسلام میں ہرگز نہیں لکھا کہ فرشتوں کے متعلق جو کچھ قرآن میں ہے وہ صرف محمد صاحب کا وہم تھا اور نہ یہ لکھا ہے کہ فرشتے درحقیقت کوئی چیز نہیں ہیں۔ خود پروفیسر صاحب نے جو فقرہ سید امیر علی صاحب کی طرف منسوب کیا ہے وہی اپنی غلطی کا آپ مظہر ہے۔ پروفیسر صاحب سید امیر علی صاحب کی طرف یہ فقرہ منسوب کرتے ہیں کہ فرشتے محمد صاحب کا وہم اور شاعرانہ نازک خیالی کا نتیجہ ہیں۔ اب ہر عقلمند انسان سمجھ سکتا ہے کہ وہم اور شاعرانہ نازک خیالی دو مخالف باتیں ہیں۔ کیونکہ وہم کسی ایسی چیز کے خیال کو کہتے ہیں جس کا وجود نہ پایا جائے لیکن کوئی شخص غلطی سے اس کے وجود کا قائل ہو۔ اور شاعرانہ نازک خیالی اُسے کہتے ہیں کہ ایک چیز تو موجود ہو لیکن اس کا ذکر استعارہ اور مجاز میں نظم یا کلام کو خوبصورت بنانے کے لئے کر دیا جائے اور یہ دونوں باتیں ایسی متضاد ہیں کہ جس چیز کو ہم وہم کہیں اُسے شاعرانہ نازک خیالی نہیں کہہ سکتے اور جس کو شاعرانہ نازک خیالی کہیں اُسے وہم نہیں کہہ سکتے۔ وہم یہ ہے کہ ایک چیز موجود نہیں اور ہم اس کو موجود خیال کرتے ہیں اور شاعرانہ نازک خیالی یہ ہے کہ ہمیں علم تو ہے کہ فلاں بات کس طرح ہے لیکن کلام کو مؤثر بنانے کے لئے ہم ایک خاص رنگ میں اُسے بیان کر دیتے ہیں۔ اس کی مثال یہ ہے کہ جیسے ایک شخص چھلاوہ کے وجود کا قائل ہو جس کی نسبت بیان کرتے ہیں کہ کبھی آدمی بن جاتا ہے کبھی گھوڑا، کبھی بکرا، کبھی نیولا، کبھی کوئی بے جان شئے غرض منٹ منٹ میں وہ کئی شکلیں بدل لیتا ہے۔ اس شخص کے اس خیال کو تو ہم وہم کہیں گے کیونکہ جو شے واقع میں موجود نہیں ہے اُسے بلا کسی ثبوت کے یہ خیال کر لیتا ہے کہ اسی طرح ہے لیکن ایک شاعر جب شمع کی نسبت بیان کرتا ہے کہ وہ ساری رات روتی ہے تو اسے ہرگز وہم نہیں کہیں گے کیونکہ شاعر یہ یقین نہیں رکھتا کہ شمع واقع میں روتی ہے بلکہ وہ اپنے قلب کے نقشہ کو اس رنگ میں بیان کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ میرا عشق اسقدر بڑھا ہوا ہے کہ ہر ایک شئے جو گھل رہی ہو مجھے یونہی معلوم

ہوتا ہے کہ گویا میری طرح محبوب کے عشق میں رو رہی ہے اور گھلتی جا رہی ہے۔ اگر کوئی شخص واقع میں یہ سمجھ لے کہ شمع روتی ہے تو پھر یہ شاعرانہ نازک خیالی نہ رہے گی بلکہ وہم ہو جائے گا۔

پس شاعرانہ نازک خیالی اور وہم دو مخالف چیزیں ہیں اور ایک شخص کا وہم اسی شخص کی شاعرانہ نازک خیالی نہیں کہلا سکتا نہ کسی کی نازک خیالی وہم کہلا سکتی ہے۔ پس پروفیسر رام دیو صاحب کا یہ فقرہ کہ سید امیر علی صاحب کے نزدیک فرشتوں کا وجود محمد صاحب کا وہم اور شاعرانہ نازک خیالی ہے اپنی آپ ہی تردید کر دیتا ہے۔

جیسا کہ میں نے اوپر بیان کیا ہے سید صاحب نے ہرگز یہ نہیں لکھا کہ فرشتوں کا ذکر جو قرآن میں آتا ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا وہم تھا۔ انھوں نے صرف یہ لکھا ہے کہ بدر کی جنگ میں فرشتوں کے اُترنے کا جو واقعہ قرآن کریم میں مذکور ہے اس کی عبارت شاعرانہ رنگ کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"قرآن کریم کے وہ چند سادہ بیان جو اس شاعرانہ رنگینی کو ظاہر کرتے ہیں جو فرشتوں کے خدا کی طرف سے لڑنے کے خیال میں پوشیدہ ہے اپنی شان اور دل آویزی میں زبور کے فصیح ترین حصول سے بھی کم نہیں ہیں۔ یقیناً ان دونوں بیانوں میں شاعرانہ رنگ نظر آتا ہے۔"

ان فقرات سے ایک تو یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ مسٹر سید امیر علی صاحب فرشتوں کے وجود کے متعلق نہیں بلکہ ان کے لڑائی میں شامل ہونے کے متعلق یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ اس میں شاعرانہ رنگینی پائی جاتی ہے۔ دوسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ فرشتوں کے وجود کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا وہم نہیں بتاتے بلکہ فرشتوں کے لڑائی میں شامل ہونے کے ذکر کو شاعرانہ رنگ کا کلام ظاہر کرتے ہیں۔ جس کے دو معنے ہو سکتے ہیں یہ بھی کہ وہ فرشتوں کے لڑائی میں شامل ہونے کے منکر نہیں بلکہ اس عبارت کی رنگینی اور فصاحت کا اظہار کرتے ہیں اور زبور جس پر مسیحیوں کو ناز ہے اس کا مقابلہ کر کے اس کی خوبی مسیحیوں پر ظاہر کرتے ہیں اور یہ بھی کہ وہ سمجھتے ہیں کہ اس جگہ فرشتوں کے لڑنے سے قرآن کریم کی مُراد واقع میں لڑنا نہیں ہے بلکہ خدا تعالیٰ کی نصرت کو اس شاعرانہ کلام کے ذریعہ سے بیان کیا گیا ہے اور مجاز اور استعارہ کو استعمال کیا گیا ہے۔ اور کیا پروفیسر صاحب اس امر کے قائل نہیں کہ خود ان کی اپنی مذہبی کتب میں مجاز اور استعارہ کا استعمال کیا گیا ہے اور کیا کوئی شخص اگر اہل ہنود کے اس کلام کے کہ ان کی مذہبی کتب میں مجاز اور استعارہ کا جو حسن کلام کی اعلیٰ صفتوں میں سے ہیں استعمال کیا گیا ہے یہ معنے کرے کہ اہلِ ہنود کے نزدیک ان کی مذہبی کتب

میں بہت سی وہمی باتیں بیان ہو گئی ہیں تو اہل ہنود اس کی عقل پر ہنسیں گے یا نہیں۔ اسی طرح اہل دانش پروفیسر صاحب کے اس بیان پر کہ مسٹر امیر علی صاحب کے نزدیک قرآن کریم میں جو فرشتوں کا ذکر آیا ہے وہ محمد صاحب کا وہم ہے زیر لب متبسم ہیں اور پروفیسر صاحب کی اس جلد بازی پر حیران ہیں جس سے انہوں نے اس حوالہ کے درج کرنے میں کام لیا ہے۔

اگر پروفیسر صاحب اس فقرہ کے ساتھ کے اگلے فقرات پڑھتے تو ان کو معلوم ہو جاتا کہ مسٹر امیر علی صاحب نہ صرف یہ کہ فرشتوں کے ذکر کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا وہم اور خیال نہیں بتاتے بلکہ ان کو اس امر میں بھی شک ہے کہ فرشتوں کا ذکر مجاز ہی ہے یا واقع میں بھی کوئی ایسا وجود ہے غرض وہ فرشتوں کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا وہم نہیں بتاتے بلکہ ان کے متعلق جو اس زمانہ کے خیالات ہیں ان کے غیر یقینی ہونے کا خیال ظاہر کرتے ہیں۔ وہ اس فقرہ کے معاً بعد جس سے پروفیسر صاحب نے غلط نتیجہ اخذ کیا ہے تحریر کرتے ہیں۔

" غالباً محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) مسیح اور دوسرے انبیاء (علیہم السلام) کی طرح ایسی درمیانی ارواح کے جو خدا اور بندہ کے درمیان پیغام رساں ہوں قائل تھے۔ اس زمانہ میں فرشتوں کا جو انکار کیا جاتا ہے وہ کوئی دلیل نہیں ہے کہ اس کی وجہ سے ہمارے آباء کے جو خیالات فرشتوں کے متعلق تھے ان کی ہنسی اُڑائی جائے۔ ہمارا انکار اسی طرح وہم کہلا سکتا ہے جس طرح ان کا یقین۔ فرق صرف یہ ہے ایک میں نفی کا پہلو ہے تو دوسرے میں اثبات کا۔ جس چیز کو ہم اس زمانہ میں اُصول طبعی خیال کرتے ہیں وہ ان کو فرشتہ اور آسمانی کارپردازان خیال کرتے تھے۔ یا جس طرح فاک کا خیال ہے، خدا اور بندے کے درمیان کوئی اور وجود بھی ہیں۔ جس طرح انسان اور ادنیٰ حیوانات کے درمیان اور وجود ہیں؟ یہ ایک ایسا باریک سوال ہے کہ انسانی عقل اس کی تہ تک نہیں پہنچ سکتی"۔

ان فقرات سے صاف ثابت ہے کہ مسٹر امیر علی صاحب فرشتوں کے وجود کو محض استعارہ قرار دینے کو بھی جائز نہیں سمجھتے اور ان کا خیال ہے کہ فرشتوں کا انکار کرنے والے اگر فرشتوں کے وجود کو ماننے کا نام وہم رکھتے ہیں تو ان کے فرشتوں کو نہ ماننے کا نام بھی وہم رکھا جا سکتا ہے اور یہ کہ فرشتوں کے وجود کا مسئلہ ایسا باریک مسئلہ ہے کہ انسانی عقل اس کی تہ تک نہیں پہنچ سکتی جس کے معنے دوسرے لفظوں میں یہ ہیں کہ ان کے متعلق ہم بحث نہیں کر سکتے ان کے متعلق بحث کرنا آسمانی کتب کا کام ہے۔ پس باوجود مسٹر امیر علی صاحب کے ایسے صریح بیان کے پروفیسر رام دیو صاحب کا یہ بیان فرمانا کہ مسٹر امیر علی صاحب قرآن میں جو فرشتوں کا ذکر ہے اسے محمد صاحب کا وہم قرار دیتے

ہیں ایک نہایت ہی حیرت انگیز بات ہے۔

سید امیر علی صاحب اور کثرتِ ازدواج

تیسری بات جو پروفیسر رام دیو صاحب نے سید امیر علی صاحب کی طرف منسوب کی ہے یہ ہے کہ کثرت ازدواج زنا کاری ہے۔ مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ یہ حوالہ بھی ایسا ہی غلط ہے جیسا کہ پچھلے دو حوالے۔ سید امیر علی صاحب نے ہرگز یہ نہیں کہا کہ کثرت ازدواج زنا کاری ہے اور یہ کہ اس امر کے متعلق اسلام کی تعلیم ناقص ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سید امیر علی صاحب کی کتاب میں ہمیں ایسے فقرات ملتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک کثرت ازدواج مہذب ممالک کے لوگوں کے لئے درست نہیں اور قابلِ ملامت فعل ہے۔ مگر ان کی کتاب پڑھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ ساتھ ہی یہ یقین بھی رکھتے ہیں کہ اسلام کی بھی یہی تعلیم ہے۔ پس انھوں نے جو کچھ بھی کثرت ازدواج کے خلاف لکھا ہے وہ گو غلط ہو مگر اسلام پر حملہ نہیں کہلا سکتا کیونکہ وہ اسے اسلام کا ہی حصہ قرار دیتے ہیں۔ سیّد امیر علی صاحب کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک نکاح کے متعلق اسلام کی دو تعلیمیں ہیں ایک تعلیم تو غیر تعلیم یافتہ زمانوں اور ملکوں کے لئے یا بعض مجبوریوں کو جو انسان کو پیش آجاتی ہیں مدنظر رکھ کر دی گئی ہے اور ایک تعلیم تہذیب کے زمانہ کے لئے اور مہذب ممالک کے لئے ہے۔ چنانچہ انھوں نے اس باب کو جس میں عورتوں کے متعلق اسلام کی تعلیم بیان کی ہے شروع ہی اس فقرہ سے کیا ہے۔ "تمدنی ترقی کے بعض درجوں میں ایک مرد کا بہت سی عورتوں سے تعلق ایک ایسا فعل ہے جس سے بچا نہیں جا سکتا" اسی باب میں وہ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ:۔

"اس امر کو ہمیشہ زیرِ نظر رکھنا چاہئے کہ کثرت ازدواج حالات پر منحصر ہے بعض زمانوں اور سوسائٹی کی بعض حالتوں میں عورتوں کو فاقہ کشی اور تباہی سے بچانے کے لئے یہ نہایت ہی ضروری ہے"۔

پھر وہ لکھتے ہیں کہ:۔

"جس جگہ ایسے ذرائع جن سے عورتیں اپنا گذارہ آپ کر سکتی ہیں مفقود ہوں وہاں کثرت ازدواج ضرور قائم رہے گی"۔

ان فقروں سے معلوم ہوتا ہے کہ سید امیر علی صاحب اگر ایک طرف بعض ممالک اور بعض زمانوں کے لئے کثرت ازدواج کو ناپسندیدہ قرار دیتے ہیں تو دوسری طرف بعض ممالک اور بعض حالات میں اس کو ضروری بھی قرار دیتے ہیں۔ پس ایسی صورت میں یہ کہنا کہ وہ کثرت ازدواج کو زنا کاری قرار دیتے ہیں ظلم نہیں تو اور کیا ہے۔

اس جگہ یہ سوال ہو سکتا ہے کہ گو سید امیر علی صاحب نے کثرت ازدواج کو بعض حالتوں میں جائز رکھا ہو مگر جبکہ ان کے نزدیک بعض حالتوں میں یہ تعلیم ناپسندیدہ بھی ہے تو اس سے یہ ثابت ہو گیا کہ ان کے نزدیک اسلام کی تعلیم ناقص ہے کیونکہ وہ صرف بعض زمانوں کے لئے اور بعض ممالک کے لئے محدود ہو گئی۔ یہ سوال سید امیر علی صاحب پر ضرور پڑ جاتا اگر یہ ثابت ہو سکتا کہ ان کے نزدیک اسلام کا صرف یہی حکم ہے کہ کثرت ازدواج ضرور کیا کرو یا یہ کہ ان کے نزدیک اسلام کے رُو سے ہر حالت میں ایک سے زیادہ بیویاں کرنی ہی پسندیدہ ہوں لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ان کا یہ عقیدہ نہیں۔ وہ اگر مہذب ممالک میں ایک ہی بیوی پر اکتفاء کرنے کا حکم دیتے ہیں تو اس کا یہ باعث نہیں کہ وہ اس تعلیم کو اپنی عقل کے رو سے درست سمجھتے ہیں اور قرآن کریم کی تعلیم میں نقص نکالتے ہیں بلکہ اس کا باعث جیسا کہ خود ان کی تحریر سے ظاہر ہے یہ ہے کہ ان کے نزدیک اسلام ہی یہ تعلیم دیتا ہے کہ کثرت ازدواج کا حکم وقتی ہے۔ وہ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اسلام کی تعلیم ہر حالت اور ہر زمانہ کے مطابق ہے اور اسی کی تائید میں وہ ایک کثرت ازدواج کا مسئلہ بھی پیش کرتے ہیں جس سے وہ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اسلام نے ہر زمانہ اور ہر قوم کے مناسب حال تعلیم دی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ:

" یہ یاد رکھنا چاہئے کہ احکام کی وسعت ان کے مفید اور نفع رساں ہونے کا بہترین ثبوت ہوتی ہے اور یہ قرآن کریم کے احکام کی خصوصیت ہے وہ اعلیٰ سے اعلیٰ سوسائٹی کے مناسب حال حکم بھی دیتا ہے اور ادنیٰ سے ادنیٰ قوم کے مناسب حال حکم بھی دیتا ہے۔"

چنانچہ وہ ایک بیوی پر اکتفاء کرنے کو قرآن کریم سے ثابت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:۔

"چونکہ احساسات کے معاملہ میں کامل عدل ناممکن ہے اس لئے قرآن کریم کا فتویٰ کثرت ازدواج کے متعلق قریباً حرمت کا ہی حکم رکھتا ہے۔"

ان عبارتوں سے ظاہر ہے کہ ان کے نزدیک اگر ایک بیوی پر اکتفاء کرنا بعض حالتوں میں ضروری ہے تو اسے بھی وہ قرآن کریم کا ہی حکم ثابت کرتے ہیں۔

مذکورہ بالا خیال کی تائید میں ان کے یہ حوالہ جات بھی پیش کئے جا سکتے ہیں وہ کثرت ازدواج کی رسم کے قانوناً روکے جانے کی خواہش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"لیکن یہ منسوخی صرف حقیقت پر آگاہ ہونے اور رسول کریم کی تعلیم کے صحیح معنے سمجھنے کا ہی نتیجہ ہو سکتی ہے۔"

اسی طرح وہ لکھتے ہیں کہ:۔

"اسبات کی اُمید کی جاتی ہے کہ جلد ہی ایک عام مجلس علماء اسلام کی فیصلہ کر دے گی کہ غلامی کی طرح کثرت ازدواج بھی اسلامی قوانین کے خلاف ہے۔"

ان حوالہ جات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ سید امیر علی صاحب (۱) کثرت ازدواج کو بلا شرط بُرا نہیں کہتے بلکہ بعض حالتوں میں اس کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ (۲) اگر وہ ایک بیوی پر اکتفاء کرنے کو مہذب سوسائٹی میں ضروری سمجھتے ہیں اور کثرت ازدواج سے اس حکم کو اچھا سمجھتے ہیں تو اس سے اسلام کی کسی تعلیم کو ناقص نہیں قرار دیتے بلکہ ان کے نزدیک یہ بھی اسلام ہی کی تعلیم ہے کہ کثرت ازدواج اصل میں بُری ہے فقط خاص حالات میں جائز ہے۔ پس ان حوالہ جات کی موجودگی میں پروفیسر صاحب کیونکر کہہ سکتے ہیں کہ سید امیر علی صاحب کے نزدیک اسلام کی تعلیم کے خلاف کثرت ازدواج زناکاری ہے۔ وہ نہ تو کثرت ازدواج کو ہر حالت میں بُرا کہتے ہیں اور نہ ایک بیوی پر اکتفاء کرنے کو قرآن کریم کی تعلیم سے جُدا ہو کر مستحسن قرار دیتے ہیں۔ ان کی تحریر کا یہ مطلب نہیں کہ قرآن کریم کی تعلیم ناقص ہے اور ہر زمانہ کے لئے نہیں بلکہ وہ تو یہ کہتے ہیں کہ قرآن کریم نے ہر زمانہ کے مطابقِ حال تعلیم دی ہے اور یہ دونوں مضمون ایک دوسرے کے ایسے ہی مخالف ہیں جیسا کہ نُور اور ظُلمت۔ پھر معلوم نہیں کہ پروفیسر صاحب نے دونوں باتوں کو ایک کیونکر سمجھ لیا۔

تعجب ہے کہ پروفیسر صاحب کو سید امیر علی صاحب کی اس تحریر میں کہ اسلام نے مختلف حالات کے مناسب مختلف احکام دیئے ہیں یہ بات تو نظر آگئی کہ وہ اسلام کے بعض احکام کو ناقص سمجھتے ہیں لیکن ان کا خیال ادھر نہیں گیا کہ انہوں نے خود ایسی ہی بات آریہ سماج کی نسبت اپنے مضمون میں لکھی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ آریہ گزٹ نے اگر یہ لکھ دیا کہ گرے ہوئے لوگ ودھوا بیاہ کر سکتے ہیں تو اس سے آریہ سماج کے کسی عقیدہ کی کمزوری ظاہر نہیں ہوتی۔ بھگوان دیانند نے بھی شودروں کے لئے ودھوا بیاہ جائز قرار دیا ہے۔ اب وہ بتائیں کہ یہ کس طرح ممکن ہے کہ اگر پنڈت دیانند صاحب لکھ دیں کہ ودھوا بیاہ بعض قوموں کے لئے جائز ہے اور بعض کے لئے نہیں تو اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ پنڈت دیانند صاحب کے نزدیک ویدک تعلیم میں نقص ہے لیکن اگر سید امیر علی صاحب یہ تحریر کریں کہ اسلام نے مختلف حالات کے مناسب حال تعلیم دیکر اپنی تعلیم کو ہر حالت اور ہر زمانہ کے لئے مکمل کر دیا ہے تب سید امیر علی صاحب کی یہ تحریر ان کے اسلام پر اعتراض کرنے کے مترادف ہے اور اس کے یہ معنے ہیں کہ وہ اسلام کے بعض احکام کو ناقص قرار دیتے ہیں۔

ببیں تفاوت راہ از کجا است تا بکجا

نا واقف کون ہے؟

اب مَیں پروفیسر صاحب کے اصل مضمون کا جواب دے چکا ہوں لیکن پیشتر اس کے کہ مَیں اپنے مضمون کو ختم کروں پروفیسر صاحب کے ایک اور اعتراض کا بھی جواب دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ وہ لکھتے ہیں کہ مَیں نے لالہ لاجپت رائے صاحب کے اس قول سے کہ بعض ہندو اُصول پندرہ سو برس سے ہندوؤں کی تباہی کا موجب ہیں جو یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اس سے معلوم ہؤا کہ ہندو مذہب کے اصول سے ان کو مخالفت ہے یہ اس بات کی علامت ہے کہ مجھے ہندو مذہب سے ناواقفیت ہے کیونکہ لالہ لاجپت رائے ہی نہیں تمام آریہ سماج اس امر کا قائل ہے کہ ہندو مذہب کی موجودہ حالت قابل تسلّی نہیں۔ پروفیسر رام دیو صاحب کے اس اعتراض کے متعلق میرے لئے اسی قدر کہدینا کافی ہے کہ میری تحریر سے ہرگز یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ مجھے ہندو مذہب سے واقفیت نہیں لیکن پروفیسر صاحب کی تحریر سے یہ نتیجہ ضرور نکلتا ہے کہ پروفیسر صاحب کو اس تحریر سے بھی ناواقفیت ہے جس کا وہ جواب لکھنے بیٹھے ہیں کیونکہ نہ لالہ لاجپت رائے صاحب کا وہ قول ہے جو پروفیسر صاحب بیان کرتے ہیں اور نہ میرا وہ استدلال ہے جس پر پروفیسر صاحب اعتراض کرتے ہیں۔ لالہ لاجپت رائے صاحب کا یہ قول نہیں کہ ہندو مذہب کے بعض خیال پندرہ سو سال سے ہماری تباہی کا موجب ہو رہے ہیں بلکہ یہ قول ہے کہ خواہ پُرانے زمانہ کی نسبت یہ اعتراض درست نہ ہو کہ ہندوستانی قدرت کی طاقتوں سے مرعوب ہیں مگر پندرہ سو سال سے تو ضرور یہ خیال ہماری تباہی کا موجب ہو رہا ہے اور میرا یہ استدلال نہ تھا کہ لالہ لاجپت رائے صاحب ہندوؤں کی موجودہ حالت کو ناقابل تسلّی سمجھتے ہیں بلکہ یہ تھا کہ وہ موجودہ حالت ہی کو ناقابل تسلی نہیں سمجھتے بلکہ پچھلی حالت کی نسبت بھی ان کو شک ہے۔

لالہ لاجپت رائے صاحب نے اس فقرہ میں خواہ کا لفظ استعمال کیا ہے اور خواہ کا لفظ ہمیشہ دو ہی معنوں میں استعمال ہوتا ہے جب دشمن مخالف ہو اور اس کے قول کی تردید کرنی ہو تو اس جگہ اس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ اس بحث کو مَیں ابھی چھیڑنا نہیں چاہتا اور جب اپنے لوگوں کو مخاطب کر کے یہ لفظ استعمال کیا جائے اور کسی قول کی تردید نہیں بلکہ تصدیق مراد ہو تو اس جگہ اس لفظ کے معنے شک کے ہوتے ہیں اور لالہ لاجپت رائے صاحب نے اس فقرہ میں پچھلی صورت میں اس لفظ کو استعمال کیا ہے جس کے معنے یہ ہیں کہ ان کے نزدیک یہ بات ثابت شدہ نہیں ہے کہ کسی پچھلے زمانہ میں ہندو لوگ قوانین قدرت کے استعمال کرنے والے اور سائنس کے موجد تھے اور یہ کہ وید تمام علوم کا سرچشمہ ہیں۔

قرآن کریم پر اعتراض کرنیکی اجازت اور بعض ضروری اُمور

پروفیسر رام دیو صاحب نے اپنے مضمون کے آخر میں اس بات کی بھی اجازت چاہی ہے کہ وہ قرآن کریم کے الہامی ہونے کے متعلق کچھ اعتراضات شائع کریں۔ جن کا جواب میں شائع کروں پھر وہ مضامین کتابی صورت میں شائع کرا دیئے جاویں۔ مجھے بہت ہی خوشی ہوئی ہے کہ پروفیسر صاحب نے میری تحریر کے مطابق اس طریق کو اختیار کرنے پر آمادگی ظاہر کی ہے اور سچی بات یہی ہے کہ کسی مسئلہ کی تحقیق اسی طریق پر ہوسکتی ہے کہ اس کے صدق و کذب کو مشاہدہ یا دلائل کے ذریعہ سے دیکھا جائے نہ اس طرح کہ زید و بکر کے اقوال کو سند لیا جائے۔ زید و بکر کے اقوال سند نہیں ہوتے ہاں کبھی بطور تائیدی دلائل کے استعمال ہو سکتے ہیں۔ لیکن بیشتر اس کے کہ وہ اس کام کو شروع کریں بعض اُمور کا تصفیہ ضروری ہے تاکہ بات شروع ہو کر ضائع نہ ہو جائے اور وہ اُمور سوال و جواب اور ان کی اشاعت کے طریق کے متعلق ہیں۔ مَیں اس جگہ اپنی رائے ظاہر کر دیتا ہوں اگر اس میں کوئی ایسی بات ہو جو ناواجب ہو یا مثلاً ایک فریق کو اس سے کوئی خاص فائدہ پہنچتا ہو تو وہ اس کی نسبت تحریر فرما دیں اس کی اصلاح ہوسکتی ہے۔ میری رائے یہ ہے۔

۱۔ چونکہ اعتراضات کا سلسلہ ایسا وسیع ہوتا ہے کہ ان کا ختم ہونا ہی ناممکن ہے۔ کیونکہ اعتراض ہر ایک شئے پر ہوسکتا ہے اس لئے اس سلسلہ کو ناواجب طوالت سے بچانے کے لئے یہ طریق اختیار کیا جائے کہ پروفیسر صاحب قرآن کریم کے الہامی ہونے کے خلاف جو اعتراض رکھتے ہوں ان میں سے تین اعتراض جو ان کے نزدیک سب سے مضبوط اور لاینحل ہوں چُن لیں اور انہی کو پیش کریں۔ یہ نہیں کہ سوال کے بعد سوال کا سلسلہ شروع ہو جائے۔

۲۔ بعض سوال بھی وسیع ہوتے ہیں اور ان کی جزئیات سینکڑوں ہوتی ہیں اس کے متعلق بھی یہ قاعدہ رہنا چاہئے کہ جزئیات بھی تین سے زیادہ نہ چُنی جاویں۔ مثلاً یہ کہ قرآن کریم پر یہ اعتراض ہو کہ اس میں بعض باتیں خلافِ قانونِ قدرت کے ہیں تو اس اعتراض کی مثالیں انتخاب کرتے وقت بھی یہ بات مدنظر رکھی جائے کہ سب سے صاف اور واضح تین مثالیں چُن لی جائیں نہ یہ کہ ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ اعتراضات کا شروع ہو جائے۔ کیونکہ جب سب سے زیادہ واضح اعتراضات کا جواب ہو گیا تو دوسری مثالوں کا جواب بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ موجود ہی ہوگا اور یہ طریق وقت کے بچانے کے لئے ایسے سلسلۂ تحریرات میں مدنظر رکھنا ضروری ہوتا ہے جس میں ایک فریق کا کام صرف

اعتراض کرنا اور دوسرے کا کام صرف جواب دینا ہو۔

۳۔ اگر یہ طریق آپ کو منظور نہ ہو تو پھر یُوں کیا جائے کہ ایک ہی وقت میں میری طرف سے وید کے الہامی ہونے پر اعتراضات ہوں اور آپ کی طرف سے قرآن کریم کے الہامی ہونے پر تاکہ ہر ایک فریق پر برابر کی ذمہ داری رہے۔

۴۔ سوال و جواب کا طریق یہ ہو کہ معترض اپنا اعتراض مع وضاحت اور تشریح کے شائع کر دے پھر مجیب اس کا جواب شائع کرا دے پھر معترض اس جواب پر اپنی جرح شائع کرا دے۔ اس کے بعد مجیب اس جرح کا جواب شائع کر دے اور اس مسئلہ کو ختم سمجھا جائے۔

۵۔ تین اعتراضات جو کئے جائیں ان کی نسبت فیصلہ کر لیا جائے کہ آیا ایک ہی دفعہ پیش کئے جاویں گے یا علیٰحدہ علیٰحدہ۔ میرے نزدیک یہ بہتر ہوگا کہ پیش اکٹھے کئے جاویں۔ آگے جواب ان کے باری باری دیئے جاویں۔ پہلے ایک سوال کا جواب اور اس پر تنقید اور پھر اس کا جواب شائع ہو جائے پھر دوسرے کو لیا جائے پھر تیسرے کو۔

۶۔ یہ انتظام کیا جائے کہ دونوں فریق کے مضامین ایک آریہ اخبار میں شائع ہوں اور ایک مسلمان اخبار میں۔ اپنی طرف سے مَیں "الفضل" پیش کرتا ہوں۔ "الفضل" میرے مضامین کے علاوہ پروفیسر صاحب کے ان مضامین کو جو اس سلسلہ میں نکلیں گے مکمل طور پر شائع کر دیا کرے گا اور پروفیسر صاحب جس آریہ اخبار میں اپنے مضامین شائع کرائیں اس کے ساتھ یہ انتظام بھی کر دیں کہ وہ میرے مضامین کو بھی جو اس سلسلہ میں نکلیں بتمامہ شائع کر دیا کرے۔ اگر اخبارات کو اس خیال سے کہ ان کے صفحات میں اس سلسلہ مضامین کے شائع ہونے کی گنجائش نہ ہوگی اس پر اعتراض ہو تو پھر یہ انتظام کیا جائے کہ ایک ضمیمہ طبع کرا کے اخبار میں شائع کرایا جائے۔ آپ کے مضامین بھی ضمیمہ کے طور پر شائع ہوں اور میرے بھی۔ ضمیمہ کا خرچ فریقین ادا کریں یا کوئی ایسی جماعت جسے اس مذہبی تحقیق سے دلچسپی ہو۔

۷۔ اگر کتابی صورت میں مضامین شائع کئے جاویں تو کسی کو اختیار نہ ہوگا کہ مضامین کے متعلق اپنی طرف سے کچھ لکھے یا مضامین میں کسی قسم کا تغیر و تبدل کرے۔ اس صورت میں بھی بہتر ہوگا کہ دونوں فریق کے متحدہ انتظام کے ماتحت مضامین شائع کئے جاویں اور دونوں فریق خرچ میں برابر کے حصہ دار ہوں اور بعد میں کتب کو تقسیم کر لیا جائے۔

۸۔ مضامین کی تحقیق کا یہ طریق ہوگا کہ کسی کلام کے معنے کرتے وقت یا خود اسی کلام کا سیاق و سباق حجت ہوگا یا اس کتاب کا محاورہ یا لغت یا قواعد صرف و نحو اور معانی یا محاورۂ زبان یا ایسے علوم

جو تمام دنیا میں تسلیم ہوتے ہیں۔ مثلاً تاریخ و جغرافیہ ہندسہ وغیرہ اور ان علوم کی بات اسی طریق پر قابلِ سند ہو گی جس طریق پر کہ علوم عقلیہ کی باتیں سند ہوتی ہیں۔

۹۔ کسی مضمون کا جواب تین ماہ سے زائد دیر کر کے نہ شائع ہو اگر اس سے زائد دیر لگے تو وہ سلسلہ ختم سمجھا جائے۔

میرے نزدیک تو یہ اُمور ایسے بدیہی اور ظاہر ہیں کہ ان پر پروفیسر صاحب کو کوئی اعتراض نہ ہونا چاہئے لیکن اگر ان میں کوئی ایسی بات ہے جو ان کے نزدیک قابلِ اعتراض ہے تو وہ اسے پیش کر دیں اور اگر کوئی بات قابلِ اعتراض نہیں تو پھر کسی اخبار سے انتظام کر کے اپنے اعتراضات قرآن کریم کے الہامی ہونے کے متعلق شائع کرا دیں پھر میں اُن کا جواب شائع کرا دوں گا۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

پروفیسر رام دیو صاحب اور صداقتِ اسلام

از سیدنا حضرت خلیفۃ المسیح الثانی

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ

خدا کے فضل اور رحم کے ساتھ

ھُوَ النَّاصِرُ

احباب کو معلوم ہوگا کہ پروفیسر رام دیو صاحب اور میرے درمیان ان کے ایک لیکچر کے متعلق تبادلہ خیالات ہوتا رہا ہے۔ پروفیسر صاحب نے اپنے آخری جواب میں تحریری مباحثہ کا جو طریق مَیں نے پیش کیا اس کو قریباً منظور کر لیا ہے اور مَیں اُمید کرتا ہوں کہ انشاء اللہ اس طریق بحث سے اچھا نتیجہ نکلے گا۔ پروفیسر صاحب نے سید امیر علی صاحب کے عقائد کے متعلق پھر بھی اس امر پر زور دیا ہے کہ ان کا قول اسلام کے خلاف حجت ہے اور یہ کہ ان کا وہی عقیدہ ہے جو پروفیسر صاحب نے بیان کیا تھا مگر چونکہ بعض مجبوریوں کی وجہ سے پہلے ہی ان کے مضمون کا جواب لکھنے میں دیر ہوگئی ہے اس لئے مَیں سردست مباحثہ کے متعلق جو کچھ انہوں نے لکھا ہے اس کا جواب لکھ دیتا ہوں اور چند روز تک ان کے مضمون کے دوسرے حصہ کا جواب بھی انشاء اللہ شائع ہو جائیگا۔

مَیں نے طوالت بحث سے بچنے کے لئے اور آسانی سے فیصلہ ہو سکنے کی غرض سے اپنے مضمون کے آخر میں کچھ شرائط لکھی تھیں اور پروفیسر صاحب سے ان کے متعلق ان کی رائے دریافت کی تھی۔ پروفیسر صاحب نے اپنے جواب میں ان کے متعلق اپنی رائے دی ہے لیکن چونکہ انہوں نے جن شرائط کی تصدیق کی ہے ان کے متعلق صرف منظوری کا ہی اعلان نہیں بلکہ میرے مضمون کو اپنے الفاظ میں دہرا دیا ہے اور بعض جگہ بعض الفاظ رہ گئے ہیں اس لئے اس امر کے معلوم کرنے کے لئے کہ وہ الفاظ غلطی سے رہ گئے ہیں یا ان کو اس پر اعتراض ہے مَیں یہ طریق اختیار کروں گا کہ جن شرائط کو میرے نزدیک انہوں نے منظور کر لیا ہے ان کے متعلق مَیں یہ تحریر کر دونگا کہ پروفیسر صاحب نے ان کو منظور کر لیا ہے۔ اگر

میری رائے غلط ہو تو پروفیسر صاحب میرے مضمون کے جواب میں اس حصہ کے متعلق جس سے ان کو اختلاف ہو اپنے خیالات کا اظہار کر دیں ورنہ یہ سمجھا جائے گا کہ ان کو اس سے اختلاف نہیں ہے۔

میں نے پہلی بات موجودہ بحث کے متعلق یہ لکھی تھی کہ پروفیسر صاحب قرآن کریم کے الہامی ہونے کے خلاف تین اعتراض جو ان کو سب سے زبردست معلوم ہوں چن لیں کیونکہ بحث کو محدود کرنے کے لئے اعتراضات کو محدود کرنا ضروری ہے۔ پروفیسر صاحب اس امر کو منظور کرتے ہیں۔

۲۔ میں نے لکھا تھا کہ ہر ایک اعتراض کی مثالیں بھی محدود ہوں کیونکہ بعض اعتراض ایسے ہو سکتے ہیں کہ ان کی مثالیں بیسیوں کی تعداد تک پہنچ جائیں اور اگر معترض ایک عام اعتراض کر کے اس کی تائید میں بیسیوں مثالیں لکھ جائے تو ان کا جواب بہت طویل عرصہ اور سینکڑوں صفحات کا محتاج ہوگا۔ پروفیسر صاحب کو اس پر اعتراض ہے اور وہ اس امر کو محدود نہیں کرنا چاہتے۔ میرے نزدیک اس امر میں بھی حد بندی مناسب اور ضروری ہے کیونکہ سوال کرنا ایک شخص کے اختیار میں ہے اور دوسرے فریق کا کام صرف جواب دینا ہے پس اس کے حقوق شرائط کے ساتھ محفوظ ہو جانے ضروری ہیں۔ ہاں اگر پروفیسر صاحب کو تین مثالیں اس اعتراض کی تشریح کے لئے کم معلوم ہوتی ہیں تو تین کی بجائے پانچ مثالوں کی حد مقرر کر لی جائے مگر حد ضرور مقرر ہونی چاہئے۔

۳۔ میں نے لکھا تھا کہ ایک طریق یہ بھی ہے کہ پروفیسر صاحب قرآن کریم کے الہامی ہونے پر اعتراض کریں اور میں انکے جواب دوں اور میں وید کے الہامی ہونے پر اعتراض کروں اور وہ اس کا جواب دیں۔ پروفیسر صاحب گو اس کو منظور کرتے ہیں لیکن یہ اعتراض کرتے ہیں کہ ایک مذہب کے جھوٹا ثابت ہونے سے دوسرا کیونکر سچا ثابت ہو جائے گا۔ میرے نزدیک یہی بات ان کے خلاف بھی کہی جا سکتی ہے کہ آپ کا مضمون تو دنیا کے آئندہ مذہب پر تھا اگر اسلام جھوٹا ثابت ہو جائے تو ویدک دھرم کیونکر سچا ثابت ہو جائے گا لیکن چونکہ وہ اس کو پسند نہیں کرتے۔ میں اس سوال کو جانے دیتا ہوں۔

۴۔ میں نے لکھا تھا کہ سوال و جواب کا طریق یہ ہو کہ پہلے معترض اپنا اعتراض پیش کرے پھر مجیب جواب دے پھر معترض اس پر جرح کرے اور پھر مجیب اس جرح کا جواب شائع کر دے اور اس کے بعد بحث ختم سمجھی جائے۔

پروفیسر صاحب اس کے متعلق تحریر کرتے ہیں کہ اگر بحث ایک ہی ہو تو پھر یہ ٹھیک نہیں

معلوم ہوتا کہ آخری موقع ایک ہی فریق کو ملے۔

مَیں پروفیسر صاحب کی توجہ اس طرف پھیرنی چاہتا ہوں کہ آخری موقع صرف ایک فریق کو اس لئے ملنا ضروری ہے کہ اعتراض کرنے کا موقع صرف ایک فریق کو ملنا ہے۔ یہ بات بالکل موٹی ہے کہ جس نے جواب دینا ہوگا وہ آخر میں بولے گا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ایک شخص دو اعتراض کرے اور جواب دینے والا جب ایک اعتراض کا جواب دے چکے تو اسے کہدے کہ ایک سوال کے متعلق آخری دفعہ تم بول چکے ہو اب مَیں نہ بولنے دونگا کیونکہ آخری دفعہ بولنے کا موقع مجھے بھی ملنا چاہئے۔ جس شخص کی حیثیت مجیب کی ہوگی اس کو آخر میں لازماً بولنا پڑیگا ورنہ وہ جواب کس طرح دیگا۔ دو دفعہ بولنے کا موقع تو صرف مزید وضاحت کے لئے رکھا گیا ہے ورنہ اصل کیفیت تو یہ ہے کہ آپ سوال کریں گے مَیں اس کا جواب دوں گا۔ جب سوال آپ کی طرف سے ہوگا اور جواب میری طرف سے تو بہر حال میرا موقع آخری ہوگا کیونکہ جواب ہمیشہ سوال کے بعد ہوتا ہے۔

اگر آپ نے آخر میں بولنے کا موقع ضرور لینا ہے تو اس کی بھی یہی صورت ہوسکتی ہے کہ اس بحث کے ساتھ ساتھ ایک اور بحث شروع ہو جس میں مَیں ویدوں کے الہامی ہونے پر اعتراض کروں پھر آپ جواب دیں۔ پھر مَیں جواب پر جرح کروں اور آخر میں آپ اس جرح کے متعلق اپنے جوابات شائع کر دیں۔ اس صورت میں ایک بحث میں آپ کو بھی آخری موقع مل جائے گا ورنہ یہ بات تو عقل کے خلاف ہے کہ سائل بھی آپ ہوں اور جواب کا آخری موقع بھی آپ کو ملے۔ آخر میں تو بہر حال جواب دینے والا ہی بولے گا۔ اگر سوال کرنے والا آخر میں موقع پائیگا تو اس بحث کا کوئی فائدہ ہی نہ ہوگا۔ پس اگر آخر میں موقع پانے کا آپکو خاص خیال ہے تو دو بحثوں کو ایک وقت میں شروع کیجئے اور اگر صرف قرآن کریم کے الہامی ہونے پر ہی آپ نے اعتراض کرنا ہے تو پھر آخری موقعہ مجھے جس نے جواب دینا ہے ملنا ضروری ہے۔

علاوہ ازیں پروفیسر صاحب یہ بھی تو دیکھیں کہ جو طریق میں نے بیان کیا ہے اس میں انصاف بھی ہے کیونکہ دو ہی موقعے ان کو ملتے ہیں اور دو ہی مجھے ملتے ہیں۔ اس طرح کہ پہلے وہ اپنے اعتراض کو مفصل اور بادلائل بیان کرینگے۔ پھر مَیں ان کے اعتراض کا جواب دوں گا اور جس امر پر ان کا اعتراض ہوگا اس کی حقیقت بیان کروں گا۔ پھر دوسری دفعہ وہ میرے بیان پر جرح کرینگے اور اس کے بعد مجھے دوسرا موقع ملے گا اور مَیں ان کی جرح کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرونگا پس دو موقعے ان کو ملے اور دو مجھے۔ لیکن اگر ان کی بات تسلیم کی جائے کہ بعض دفعہ ان کو آخر میں موقع

دیا جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ انکو دو موقعے ملیں گے اور مجھے ایک کیونکہ سب سے پہلی دفعہ بوجہ سائل یا معترض ہونے کے انہیں موقع ہوگا۔ اس کے بعد مجھے پھر ان کو۔ پس ان کو دو موقع ملیں گے اور مجھے ایک۔ اور یہ بات انصاف کے خلاف ہے کہ ایک امر کا ثابت کرنا بھی میرے ذمہ نہ ہو جو خود آپ کی تحریر کے مطابق اعتراض کی نسبت مشکل ہوتا ہے اور موقع بھی مجھ کو ایک ہی دیا جائے۔

پروفیسر صاحب نے اس امر کو تسلیم کرلیا ہے کہ معترض تینوں اعتراضات اکٹھے شائع کردے بلکہ وہ لکھتے ہیں کہ مجیب جس سوال کا چاہے پہلے جواب دے اور جس کا چاہے پیچھے جواب دے میں اس کے متعلق اس قدر لکھدینا ضروری سمجھتا ہوں کہ پروفیسر صاحب نے یہ جو سہولت رکھی ہے کہ مجیب جس سوال کا چاہے جواب پہلے دے اور جس کا چاہے پیچھے اس سہولت پر ان کا ممنون ہوں لیکن اس کی مجھے ضرورت نہیں۔ میں اللہ تعالیٰ کے فضل سے اس امر کے لئے تیار ہوں کہ جس سوال کو وہ پہلے لیں میں اس کا جواب پہلے لکھوں۔ صرف میری اس قدر خواہش تھی کہ تینوں سوالات ایک ساتھ بیان ہو جائیں تا اعتراضات کا حلقہ جواب دینے وقت مدنظر رہے اور مجیب اپنے وقت اور فرصت کا خیال رکھ سکے۔

یہ بات بھی ضروری نہیں کہ تینوں سوالات کو پہلی ہی دفعہ مشرح اور واضح کرکے با دلائل بیان کیا جائے۔ بلکہ یہ بھی اجازت ہوگی کہ جس سوال کا جواب پروفیسر صاحب پہلے لینا چاہیں اس کے متعلق پوری تشریح سے اپنے سوال کو مع ان دلائل کے جن کی بناء پر ان کو وہ اعتراض پیدا ہوئے ہیں شائع کرادیں اور دوسرے سوالات کو مجملاً بیان کردیں اور پھر ان کی باری پر ان کی تشریح کردیں۔

اس جگہ میں یہ بھی لکھ دینا مناسب سمجھتا ہوں کہ سوال کرنے سے میرا یہ مطلب نہیں ہے کہ پروفیسر صاحب صرف سوال ہی لکھ دیں۔ بلکہ ان کو اجازت ہوگی کہ وہ اپنے اعتراض کو زوردار بنانے کے لئے جس قدر چاہیں وضاحت کو کام میں لائیں اور وہ وجوہات بہ تفصیل بیان کریں جن کی بناء پر ان کو وہ اعتراض پیش کرنے کا خیال پیدا ہؤا ہے اور جس کی بناء پر اس مسئلہ کو جس پر وہ اعتراض کریں گے وہ قرآن کریم کے الہامی ہونے کے خلاف سمجھتے ہیں۔ گویا سوال نام اس اعتراضی پرچہ کا ہوگا جس میں ایک خاص مسئلہ کو مدنظر رکھتے ہوئے وہ قرآن کریم کے غیر الہامی ہونے کے خلاف بحث کریں گے۔ یہ تو ان کے حقوق کی حد ہے آگے ان کا یہ اختیار ہے کہ صرف

سوال ہی پیش کر دیں اور میرے جواب پر جرح کرنے پر ہی اکتفاء کریں۔

مَیں اس جگہ پروفیسر صاحب کی اس غلط فہمی کا بھی ازالہ کر دینا چاہتا ہوں کہ الزامی جوابات کی اجازت نہ ہوگی میرے کسی حصہ مضمون میں یہ بات نہیں آئی کہ الزامی جوابات کی اجازت نہ ہوگی۔ مجیب کے دائرہ جواب کو محدود نہیں کیا جا سکتا اگر وہ ایسے الزامی جواب ہی دیگا جس سے یہ معلوم ہو کہ اگر اس کا مذہب جھوٹا ہے تو معترض کا بھی جھوٹا ہے تو خود اُسے نقصان پہنچے گا لیکن اگر وہ سائل کو یہ بات سمجھانے کے لئے کہ جس بات کو وہ صداقت کے خلاف سمجھتا ہے وہ صداقت کے خلاف نہیں کیونکہ وہی یا ویسی ہی بات یا اس سے بڑھ کر کوئی بات اس مذہب میں موجود ہے جسے وہ سچا سمجھتا ہے تو اس کو اس امر سے روکنا انصاف کے بالکل خلاف ہے۔ الزامی جواب ہمیشہ کمزوری پر دلالت نہیں کرتا بلکہ بسا اوقات ایک صداقت کو منوانے کے لئے سب سے چھوٹا راستہ ہوتا ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص کسی انسان پر یہ اعتراض کرے کہ تو شریف آدمی نہیں ہے اور مَیں شریف آدمی ہوں کیونکہ تُو فلاں کام کرتا ہے اور وہ کام شرافت کے خلاف نہ ہو اور وہ شخص جس پر اعتراض ہُوا ہے آگے سے یہ جواب دیدے کہ یہ کام تو تُو بھی کرتا ہے تو اسے کوئی الزامی جواب کہہ کر کمزور نہ کہے گا۔ یہ جواب تو سب سے زیادہ قریب الفہم ہوگا اور بہت جلد دوسرے آدمی کی سمجھ میں آجاویگا کہ میری غلطی تھی۔ الزامی جواب اسی وقت کمزور ہوتا ہے جبکہ وہ بات جس پر اعتراض کیا گیا ہو واقع میں بُری ہو اور مجیب اپنے عیب کو اس پردہ میں چھپانا چاہے کہ دوسرا بھی ویسے ہی عیب میں مبتلاء ہے۔

غرض الزامی جواب کا دروازہ بند نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اس کی بعض اقسام حقیقی جواب ہی کی طرح مضبوط ہوتی ہیں اور تصفیہ کی صورت پیدا کرنے میں بہت ممد ہوتی ہیں۔

اس جگہ ایک سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ الزامی جواب اعتراض کا رنگ رکھتا ہے اور جب مجیب کو الزامی جواب دینے کی اجازت ہوگی تو گویا اس حصہ میں مجیب سائل ہو جائیگا اور سائل مجیب ہو جائیگا اور وہی بے انصافی کا سوال آجائیگا کہ آخری پرچہ سائل کا ہوگا۔ سو اس کا جواب یہ ہے کہ اس بے انصافی کے دُور کرنے کے لئے یہ صورت کی جا سکتی ہے کہ مجیب کے پہلے پرچہ میں جو الزامی جوابات آئیں ان کے جواب یہ سائل دے تو اس حصہ کی بحث وہیں ختم سمجھی جائے۔ اپنے آخری پرچہ میں ان الزامی جوابات کا ذکر مجیب نہ کرے۔ ہاں یہ ضروری ہوگا کہ مجیب کے جواب پر یہ نوٹ کر دیا جائیگا کہ اسے ان الزامی جوابات کا جواب الجواب دینے کی اجازت نہ تھی۔

اخبارات میں اس بحث کی اشاعت کے متعلق پروفیسر صاحب نے پسند کیا ہے کہ ان کے سوالات اور میرے جوابات اور پھر جواب الجواب اور پھر اس کا جواب بطور ضمیمہ پرکاش اور الفضل میں شائع ہو جائیں۔ پرکاش کے ضمیمہ کا خرچ ان کے ذمہ ہوگا اور الفضل کے ضمیمہ کا خرچ میرے ذمہ۔ میرے نزدیک بہتر تو یہ تھا کہ بجائے الگ ضمیمہ شائع کرنے کے دونوں اخبارات کے ان نمبروں کے جن میں ہمارے سوال و جواب چھپیں صفحات بڑھا دیئے جایا کریں۔ لیکن اگر یہ بات ناممکن ہو تو یہ ضرور ہونا چاہیئے کہ الفضل اور پرکاش دونوں کے ایڈیٹر اس ذمہ داری کو اُٹھائیں کہ وہ خود اطمینان کر لیا کریں گے کہ تمام خریداروں کو ضمیمہ بھیجدیا گیا ہے۔ الفضل کی طرف سے مَیں یہ اقرار کرتا ہوں کہ اس میں اصل اخبار میں ہی پروفیسر صاحب کے اور میرے مضامین شائع ہونگے اور حسب ضرورت اخبار کے صفحات بڑھا دیئے جایا کرینگے۔

پروفیسر صاحب نے اس امر کو بھی منظور کیا ہے کہ مشترکہ خرچ پر اس مباحثہ کے سب مضامین بلا کم و کاست متحدہ انتظام کے ماتحت کتابی صورت میں بھی شائع کرائے جائیں اور بعد میں کتب تقسیم کر لی جائیں۔

کلام کے معانی کرنے کے متعلق پروفیسر صاحب نے تسلیم کر لیا ہے کہ سیاق و سباق اور صرف و نحو اور بیان و معانی اور محاورۂ زبان اور لغت اور اس کتاب کا محاورہ حجت ہوگا یا سند کے طور پر علوم مسلّمہ کو انہی شرائط کے ساتھ جن شرائط کے ساتھ ان کی باتیں تسلیم کی جاتی ہیں پیش کیا جا سکے گا۔

یہ بھی پروفیسر صاحب نے تسلیم کر لیا ہے کہ کسی مضمون کا جواب تین ماہ سے زائد عرصہ میں شائع نہ ہوگا اگر کسی فریق کی طرف سے اس عرصہ میں جواب شائع نہ ہو تو بحث کا خاتمہ سمجھا جائیگا اور اسی صورت میں مباحثہ کے مضامین شائع کرا دیئے جائیں گے۔

چونکہ سوائے چند باتوں کے جن پر پروفیسر صاحب کو اعتراض تھا باقی سب امور طے شدہ ہیں اور جونکہ ان کے متعلق بھی مَیں اب وضاحت کر چکا ہوں اس لئے اگر پروفیسر صاحب کو میری اوپر کی تحریر سے اتفاق ہو تو وہ ان تین اعتراضات کو شائع کرا دیں جن کی بناء پر قرآن کریم کے الہامی ہونے میں انکو کلام ہے اور ان اعتراضات کو وضاحت سے بیان کر دیں جس کا تصفیہ سب سے پہلے کرنا وہ پسند کرتے ہوں انکے مضمون کے شائع ہونے پر میں انکا مضمون الفضل میں شائع کروا دونگا اور اپنا جواب بھی شائع کرا دونگا اور اسی طرح یہ سلسلہ مطابق شرائط چلتا چلا جائیگا۔

خاکسار

مرزا محمود احمد